عُمر خیّام

اور دُوسری غیر ملکی کہانیاں

انگریزی — گجراتی
بنگالی — ہندی
انڈونیشی — نیپالی
یوگوسلاوی — روسی
امریکی — چیکوسلواکی
تیلگو — نارویجین

تہذیب و ترجمہ
علی حیدر ملک

عُمر خیّام

اور دُوسری غیر مُلکی کہانیاں

تہذیب و ترجمہ :

علی حیدر ملک

عمر خیام

اور دوسری غیر ملکی کہانیاں

تہذیب و ترجمہ

علی حیدر ملک

بساطِ ادب (پاکستان)

کتاب	:	عمر خیام اور دوسری غیر ملکی کہانیاں (ترجمہ افسانے)
مترجم	:	علی حیدر ملک
طبع اوّل	:	نومبر ۱۹۹۹ء (شعبان المعظم ۱۴۲۰ ہجری)
سرورق	:	شمیم احمد باذل
کمپوزنگ	:	سوفٹ سیک کمپیوٹرز (656298)
		(سی ۱۵۔ بلاک ۱۸۔ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی)
تعداد	:	پانچ سو
قیمت	:	ایک سو پچاس روپے (-/Rs:150)
طابع	:	این۔ اے پرنٹرز
ناشر	:	بساطِ ادب (پاکستان) آر ۱۹۔ بلاک ۲۰۔ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

تقسیم کار

فرید پبلشرز۔ اُردو بازار۔ کراچی

دوست، بھائی اور مُحسن

رفیق عالم ملک

کے نام

جواَب اِس دُنیائے آب و گِل میں نہیں ہے
لیکن میرے نہاں خانہء دل میں ہمیشہ موجود رہے گا

کوائف:

نام	:	علی حیدر ملک
والد کا نام	:	مظہر العلیم (مرحوم)
تاریخ پیدائش	:	۷ راگست ۱۹۴۴ء
آبائی وطن	:	موضع ملاٹھی۔ ضلع۔ گیا (بھارت)
تعلیم	:	بی۔اے (آنرز) ایم۔اے
پیشہ	:	درس و تدریس

(شعبہ اُردو، وفاقی گورنمنٹ اُردو کالج۔ کراچی)

مطبوعات:

بے زمیں بے آسماں	(افسانے)
افسانہ اور علامتی افسانہ	(مضامین)
دبستان مشرق	(ترتیب)
اُردو ٹائپ اور ٹائپ کاری	(ترتیب)
شہزاد منظر فن اور شخصیت	(ترتیب بہ اشتراک صبا اکرام)
شاہ لطیف بھٹائی نمبر "برگ گل"۔	(ترتیب)

ترتیب

۱)	یہ ترجمہ کہانیاں	علی حیدر ملک	۹
۲)	ستارہ شناس عمر خیام	مینوئل کومروف	۱۳
۳)	خاموشی	ایچ۔ای بیٹس	۶۸
۴)	بے گناہی	سین او فاؤلین	۷۳
۵)	مختصر تفریح	ایلوبن واوگ	۷۹
۶)	عورت ذات	جارج ایڈلے	۸۷
۷)	جنگل کا کوا	جان اپڈائیک	۹۴
۸)	دل اس کا زہریلا	حسن عزیز الحق	۹۹
۹)	باپ کا قاتل	رشید حیدر	۱۱۳
۱۰)	یگانہ بیگانہ	رسیک متا	۱۲۰
۱۱)	جکارتہ جانے والی گاڑی	ادریس	۱۴۰
۱۲)	ہچکولے	درگا پرساد سریشٹ	۱۴۵
۱۳)	محبت	میکسم گورکی	۱۵۱
۱۴)	بلب خور	جولیس فیوچک	۱۵۵
۱۵)	ہم سفر	برانکو کوپچ	۱۵۹
۱۶)	باپ	جوجوزرسن	۱۶۶
۱۷)	بے رنگ زندگی	شنکر منجی پار تھسار تھی	۱۷۱

۱۸)	بیان	کملیشور	۱۷۹
۱۹)	مس میتھیوز	مالتی جوشی	۱۹۱
۲۰)	تعزیت	اُوشا پرانڈے	۲۰۵
۲۱)	شاعر کا عشق	ایس۔ این۔ منشی	۲۱۸

یہ ترجمہ کہانیاں

ایک جائزے کے مطابق دنیا میں اس وقت کم و بیش پانچ ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں اور ان سب زبانوں میں کسی نہ کسی درجے کا ادب بھی تخلیق کیا جا رہا ہے لیکن کسی بھی آدمی کے لیے اس ادب سے واقفیت مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کیونکہ آدمی کی زبان سیکھنے کی صلاحیت بہرحال محدود ہوتی ہے۔ دنیا کے زیادہ تر لوگ بس ایک یا پھر دو زبان جانتے ہیں کچھ لوگ جو زبانیں سیکھنے کا غیر معمولی شوق رکھتے ہیں دو سے زیادہ زبانیں بھی سیکھ لیتے ہیں۔ اس کے باوجود تاریخ میں زیادہ سے زیادہ کچھ ہفت زباں افراد ہی کا ذکر نظر آتا ہے۔ اس سے زیادہ زبانیں جاننے والوں کا نہیں۔ ایسی صورت میں دنیا کی دوسری زبانوں کے ادبیات تک رسائی کا واحد ذریعہ ترجمہ ہوتا ہے۔ دوسری زبانوں کے ادبیات کا مطالعہ اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس طرح ہم کرۂ ارض کے مختلف علاقوں میں آباد انسانوں کے مزاج اور طرز فکر سے آشنائی حاصل کر سکتے ہیں۔ علم و ادب کی دنیا میں ترجمے کے تعلق سے مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سیکڑوں سال پہلے مشرق کے ابن رشیق نے خیال ظاہر کیا تھا کہ

"ترجمہ نقل کلام ہے۔ نقل معانی و مطالب نہیں۔ نقل کلام کا تقاضا ہے کہ جس زبان میں نقل ہو ویسا ہی اثر پیدا کرے جیسا کہ اصل زبان میں تھا اور یہ بھی لازم ہے کلام سے مکالمے کی صورت پیدا ہو ورنہ ترجمہ بے معنی شئے ہے"۔

جاتی صدی میں مغرب کے ایذرا پاؤنڈ نے کہا کہ:

"ادبی تخلیق کا ایک عظیم دور ہمیشہ ترجمہ کا بھی عظیم دور ہوتا ہے یا پھر نتیجہ کے طور پر فوراً پیدا ہوتا ہے"۔

ایذرا پاؤنڈ نے یہ شکایت بھی کی ہے کہ

"ہمارے مورخین مترجمین کو بہت کم اہمیت دیتے ہیں"۔

ہمارے عہد کے اردو ادیبوں میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ترجمے کے سلسلے میں نہایت وقیع کام کیا ہے۔ ابھی کچھ دنوں قبل ڈاکٹر جالبی نے راقم الحروف کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ

"ترجموں کی اس لیے غیر معمولی اہمیت ہے کہ اس سے نئی ہوا کے جھونکے آتے ہیں اور کسی ادب کی روایت کے بند دروازے کھل جاتے ہیں۔ ادب کی روایت چلتے چلتے جب کسی ایسے مقام پر پہنچ جاتی ہے کہ خود کو دہرانے کے سوا اور کوئی راستہ اسے نظر نہ آئے تو دوسری زبانوں کے ترجمے اس کی روایت کے سامنے کھڑی دیوار کو ڈھا دیتے ہیں اور کھلا وسیع میدان اس زبان کے لکھنے والوں کے سامنے آجاتا ہے.... ترجمے تو زندہ زبان کو نئے معیار اور نئے خیالات سے روشناس کرانے کا کام کرتے ہیں"۔

غرض یہ کہ مختلف زمانوں اور زبانوں کے اہل حرف و دانش نے اپنے اپنے انداز میں ترجمے کی اہمیت و افادیت کا اعتراف کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ لوگوں نے ترجمے کو مشکل اور کچھ نے تقریباً ناممکن بھی قرار دیا ہے لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ساری باتیں دراصل شاعری کے ترجمے سے متعلق کہی جاتی رہی ہیں۔ نثر کے ترجمے کے حوالے سے کوئی خاص بات نہیں کہی گئی۔

دشواریوں اور اعتراضات کے باوجود ایک زبان کے ادب کا ترجمہ دوسری زبان میں زمانہ قدیم سے ہوتا رہا ہے اور لوگ اس سے استفادہ بھی کرتے رہے ہیں۔

اردو میں بھی مشرق اور مغرب کی مختلف زبانوں کے ادب پاروں کا ترجمہ ایک عرصے سے ہوتا رہا ہے۔ خاص طور پر اردو افسانے کی بے حد قلیل مدت میں غیر معمولی اور نہایت تیز رفتار ترقی کا ایک بڑا سبب بھی یہی نظر آتا ہے کہ مغربی افسانوں کے ترجمے اردو میں کثرت سے کیے گئے جس سے ایک طرف جہاں ہمارے لکھنے والوں نے بہت کچھ سیکھا وہاں دوسری طرف پڑھنے والوں کے شعور میں بھی اضافہ ہوا۔

میں بھی طبعزاد افسانے اور مضامین وغیرہ لکھنے کے علاوہ مختلف زبانوں کے افسانوں کے تراجم بھی کرتا رہا ہوں۔ کبھی اپنی پسند سے اور کبھی کسی مدیر کی فرمائش پر اس طرح گزشتہ تیس سال کے دوران میں نے پچاسیوں افسانے ترجمہ کر ڈالے جو

رسالوں میں شائع ہوتے رہے... یہاں یہ وضاحت شاید ضروری ہے کہ اگرچہ میں نے دنیا کی دسیوں زبانوں میں لکھے گئے افسانوں کو اردو میں منتقل کیا ہے لیکن یہ سب افسانے براہ راست ان کی اصل زبان سے منتقل نہیں کیے گئے ہیں بلکہ میں نے درحقیقت تمام ترجمے انگریزی، ہندی اور بنگالی سے کیے ہیں کیونکہ میں صرف یہی زبانیں جانتا ہوں۔ یہ افسانے موضوع اور ماحول کے اعتبار سے بہت تنوع کے حامل ہیں۔ ان کے اسالیب اور تکنیکیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔

میں ترجمے کرتا رہا اور یہ رسالوں میں شائع بھی ہوتے رہے مگر مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ انھیں کتابی صورت بھی دینی چاہیے لیکن بعض دوستوں اور شاگردوں کے اصرار پر ایسا کرنا پڑا۔ برادرم یاور امان اور عزیزی فوقیہ مشتاق نے رسالوں سے افسانے جمع کرکے ان کے انتخاب کی ذمہ داری قبول کی۔ عزیزم اقبال مجیدی نے فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بنوائیں اور انھیں درست کیا۔ بھائی جاوید وارثی نے طباعت و اشاعت کا سارا بوجھ اپنے کاندھوں پر لے لیا۔ پروف ریڈنگ اور ترتیب کا فریضہ یارجانی اے خیام نے انجام دیا جبکہ پیارے دوست صبا اکرام نے رابطہ کار کا کردار ادا کیا۔ اس طرح یہ کتاب "عمر خیام اور دوسری غیر ملکی کہانیاں" برادرم شمیم احمد باذل کی تزئین و حسن کاری کے ساتھ تیار ہو گئی ورنہ میرے لئے یہ سب کچھ کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ اب یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ ہی بہتر فیصلہ کریں گے کہ یہ کیسی ہے... اور یہ کہ آیا اس کی ضرورت تھی بھی یا نہیں؟

علی حیدر ملک

A-2 ، بلاک-N

نارتھ ناظم آباد، کراچی

۲۵ نومبر ۱۹۹۹ء

مینوئل کومروف
(انگریزی)

ستارہ شناس عمر خیام

وہ صبح بہت خوبصورت تھی۔ نیلے آسمان کے نیچے ہر طرف پھولوں کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ عمر خیام اپنا کوئی شعر گنگناتا ہوا نیشاپور کی گلیوں سے گزر رہا تھا۔ اس کی منزل وہ باغ تھا جہاں اس کی محبوبہ رہتی تھی۔

جس وقت وہ بازار سے گزر رہا تھا اس وقت دکاندار اپنی دکانیں کھول رہے تھے اور خوانچے والے اپنے خوانچوں پر سایہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حجام، جولاہے، بڑھئی اور دوسرے کاریگر بھی اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ حلوائی اپنے چولھے جلا رہے تھے جس کا دھواں ادھر ادھر بکھر رہا تھا۔ پرندے بیچنے والے اوپر تلے پرندوں کے پنجرے رکھے گھوم رہے تھے۔ غلاموں کی تجارت کرنے والا ایک تاجر اپنے پابہ زنجیر غلاموں کو لئے ایک طرف بیٹھا تھا۔

چلتے چلتے عمر خیام کی نظر دانش گاہ سینا کے میناروں پر پڑی۔ اپنی جائے پیدائش نیشاپور کی اس عظیم درسگاہ میں اس نے ایک طالب علم اور شاعر کی حیثیت سے بہت سے اعزازات حاصل کئے تھے۔ الجبرا اور علم ہیئت کے میدان میں اس کے کارنامے اتنے غیر معمولی تھے کہ سینا کی درسگاہ میں اسے درس دینے کی دعوت دی گئی تھی اور غیر ملکی عالم اور نوجوان شہزادے اس کی تقریریں سنتے تھے مگر وہ اپنے ان اعزازات کی طرف سے بے پروا تھا۔ شہرت کی اس کی نظروں میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔

وہ اسی طرح گنگناتا چلا جا رہا تھا۔ پھر وہ ایک باغ کی چہار دیواری کے پاس رک گیا۔ یہی اس کی منزل تھی۔ اسی چہار دیواری کے پیچھے اس کی محبوبہ شیریں رہتی تھی۔ وہ تیزی سے دیوار پر چڑھا اور پھر ایک درخت کا سہارا لے کر باغ میں اتر گیا۔ پھولوں سے لدی ہوئی بادام کی شاخوں کے درمیان سے اس نے دیکھا کہ شیریں تالاب کے کنارے نہا رہی ہے۔ شیریں کا نصف بدن پانی میں تھا اور نصف پانی سے اوپر۔ بھیگی ہوئی سیاہ گھنی زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں اور پانی کے ننھے ننھے قطرے اس کے جسم پر موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

کیا انسانی جسم اتنا حسین اور پرکشش ہو سکتا ہے؟ ۔ خیام نے ایک لمحہ کو سوچا اور پھر اس خوبصورت منظر کو دیکھنے میں محو ہو گیا۔ شیریں کی کنیز نے خیام کو اس طرح ٹکٹکی باندھے دیکھکر ایک چادر تان دی۔ خیام اپنے اور شیریں کے درمیان حائل چادر کو دیکھ کر زیر لب مسکرایا۔ پھر وہ کچھ دیر تک ادھر ادھر دیکھتا اور انتظار کرتا رہا۔ چند محوں بعد شیریں اپنے بھیگے بدن کو ایک ریشمی چادر میں لپیٹے تالاب سے باہر آئی۔ جیسے ہی وہ تالاب سے باہر آئی خیام نے اسے آواز دی۔ "شیریں!"۔

شیریں نے اس کے قریب آکر کہا۔ "میرے محبوب! جو سب کچھ جانتا ہے اسے سب کچھ دیکھنا نہیں چاہئے"۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر مسکراتی ہوئی بولی۔ "آؤ۔ تالاب کے کنارے بیٹھیں"۔ وہ دونوں تالاب کے کنارے بیٹھ گئے۔ شیریں اپنے گیلے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ شاخوں سے چھن چھن کر آنے والی سورج کی کرنوں نے اس کی سیاہ زلفوں کو سنہری بنا دیا تھا۔ "میری جان!" خیام نے کہا۔ "نیشاپور میں صرف یہ باغ ہی ایک پر سکون جگہ ہے۔ جب سے شاہ نے اپنا دارالحکومت یہاں منتقل کیا ہے کہیں سکون نہیں ہے۔ گلی کوچے سپاہیوں، گورنروں اور شہزادوں سے بھر گئے ہیں۔ اور جہاں شہزادے ہوں وہاں فقیر بھی ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہر آدمی عہدے اور مراعات کے لالچ میں محل کی سمت جا رہا ہے"۔

"تم صحیح کہتے ہو"۔ شیریں نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ "نااہل لوگ ہمیشہ

لالچی ہوتے ہیں مگر باصلاحیت لوگ کسی چیز کی پروا نہیں کرتے۔ تم بھی چاہو تو بہت کچھ حاصل کر سکتے ہو..... تمہارا نام ایران کے کونے کونے میں مشہور ہے شاہ تمہیں نوازنے میں مسرت محسوس کریں گے"۔

"اس طرح کی چیزیں میرے لئے نہیں ہیں۔ کیا تم مجھے کسی زرتار لبادے میں کسی سرکاری کارندے کی طرح جھکے ہوئے دیکھنا پسند کرو گی؟۔ نہیں۔ یہ سب سرکاری جھمیلے میرے لئے نہیں ہیں۔ میری جگہ تمہارے پاس ہے۔ میں اسی سے مطمئن ہوں۔ دوسروں کو اعزاز اور عہدے کے پیچھے بھاگنے دو..... میری آنکھوں میں دیکھو۔ تمہارے چہرے کا عکس پھول کی مانند نظر آرہا ہے۔ شاہ مجھے اس سے زیادہ پرشوکت اور کیا چیز عطا کر سکتے ہیں؟۔ دل کی سلطنت ہر سلطنت سے بڑی ہوتی ہے"۔ اس نے آگے کی طرف جھک کر مسکراتی ہوئی شیریں کی زلفوں کو چوم لیا۔ "میں جس دولت کا مالک ہوں فوجیں اسے فتح نہیں کر سکتیں"۔ اس نے کہا۔ "تمہارے والد دانش گاہ سینا کے سربراہ ہیں اور میں ان کا شاگرد ہوں۔ ہم لوگ سرزمین علم کے فاتح ہیں۔ ہمارے اندر کی دنیا اس پوری کائنات سے بڑی ہے۔ عشق کے بغیر کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ جنت دل کے اندر ہے۔ اور میرا ایمان ہے کہ جنت زندہ لوگوں کے لئے بنائی گئی ہے مردوں کے لیے نہیں"۔ وہ ذرا سا رکا اور رک کر مسکرایا" ۔یہ بیش بہا نکتہ میں نے تم سے ہی سیکھا ہے"۔

"ہم پہلی بار اسی باغ میں ملے تھے"۔ شیریں نے کہا.... "یہی ہماری جنت ہے"

"شیریں".... اچانک ایک آواز سنائی دی۔

"ابو آگئے"۔ شیریں نے سرگوشی کی"۔ ان کی نظر تم پر نہیں پڑنی چاہیئے"۔

"شیریں! تم کہاں ہو؟".... اس کے والد نے پھر آواز لگائی۔

خیام نے شیریں کی زلفوں کو چوما اور دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف گلی میں اتر گیا۔ شیریں دوڑتی ہوئی اپنے والد کے پاس چلی گئی۔ شیریں کے والد امام موافق کے

ہاتھوں میں تہہ کیا ہوا ایک کاغذ تھا جس پر شاہی فیتہ لپٹا ہوا تھا اور مہر لگی ہوئی تھی۔ "مجھے محل میں طلب کیا گیا ہے لیکن اس کی وجہ نہیں بیان کی گئی"۔ انہوں نے کہا ان کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار تھے۔

"چونکہ آپ نے دانش گاہ سینا کی خلوص کے ساتھ خدمت کی ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ....."

"نہیں۔ یہ کسی انعام و اکرام کی بات نہیں بلکہ شاہ کے ساتھ ایک نجی ملاقات ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی بہت ہی مشکل اور تکلیف دہ معاملہ ہوگا"۔ وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگئے۔ پھر بولے۔ "مجھے فوراً تیار ہو جانا چاہئے"۔

خیام اپنی رہائش گاہ کو واپس جانے کے لئے بازار سے گزر رہا تھا کہ معاً شہر کے پھاٹک کے قریب اسے روک دیا گیا کیونکہ وہاں سے ایک قافلہ گزر رہا تھا۔ قافلے کا سربراہ سفید عربی گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے پیچھے دو اونٹ تھے جن کے ہودے سنہرے پردوں سے گھرے ہوئے تھے۔ آٹھ مسلح افراد ان اونٹوں کی حفاظت کر رہے تھے۔ جیسے ہی یہ مختصر سا قافلہ قریب آیا خیام نے آواز بلند کی "۔ حسن!"

سفید گھوڑے پر سوار شخص نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ "عمر یہ تم ہو"۔ اس نے کہا اور گھوڑے سے کود کر خیام سے بغلگیر ہو گیا۔ "کتنے دنوں بعد ملے ہو۔ تم سے مل کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ میں تمہیں نیشاپور میں تلاش کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا مگر اچھا ہوا تم مل گئے ایسا لگتا ہے جیسے تم مجھ سے ملنے کے لئے ہی پھاٹک تک آئے تھے"۔

وہ دونوں پرانے دوست تھے مگر زمانہ طالب علمی کے بعد ان کی آپس میں ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ "حسن! دس برسوں کے اندر تم میں بہت کم تبدیلی آئی ہے"۔ خیام نے کہا۔

"تم بھی ویسے ہی مسرور اور لاپروا نظر آتے ہو"۔ حسن نے کہا۔ "حتیٰ کہ یہ لبادہ بھی جو تم پہنے ہوئے ہو وہی پرانا والا معلوم ہوتا ہے"۔

خیام نے اپنے لبادے کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا۔"میرے خیال میں اس لبادے میں کوئی خرابی نہیں ۔ہاں! میں نے سنا تھا کہ تم ایک کامیاب آدمی بن گئے ہو۔اور گیلان کے گورنر نے تمہیں کسی اعلیٰ عہدے کے لئے منتخب کر لیا ہے"۔

"جو کچھ تم نے سنا وہ صحیح ہے"۔

"اور اب تم کیا ہو"؟.... خیام نے پوچھا۔

"میں اب بھی وہی ہوں جو پہلے تھا.... یعنی تمہارا دوست"۔حسن نے جواب دیا اور دونوں ہنسنے لگے۔

خیام نے اونٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔"تم نیشاپور کیسے آئے؟"

یہ ایک طویل داستان ہے"۔حسن نے کہا۔"جب ہم پڑھتے تھے تو نیشاپور ایک چھوٹی سی جگہ تھی لیکن اب ایران کی تمام سڑکیں نیشاپور کو جاتی ہیں"۔اس نے ہودوں کی سمت اشارہ کیا۔"یہ سب شاہ کے لئے تحفے ہیں۔ان تحفوں کو دیکھ کر شاہ یقیناً خوش ہوں گے"۔یہ کہہ کر حسن نے ایک طلائی پیالہ خیام کو پیش کیا اور پوچھا۔

"کیاں تمہیں اپنا دوست نظام یاد ہے؟ وہ تو اب شاہ کے دربار میں نہایت اعلیٰ عہدے پر فائز ہے"۔چلو اس سے مل آئیں۔حسن، خیام کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چلنے لگا۔اس کے پیچھے پیچھے اس کا عربی گھوڑا، ہودوں والے اونٹ اور مسلح محافظ بھی چلنے لگے۔

"اب جبکہ دارالحکومت نیشاپور منتقل ہو گیا ہے میرا خیال ہے کہ تمہاری ملاقات نظام سے اکثر ہوتی ہو گی"۔حسن نے چلتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ۔میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی ۔میں دربار اور درباری لوگوں سے ذرا دور ہی رہتا ہوں ۔محل میں ہمیشہ غرض مندوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے ۔مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں اس لئے میں اس سے دور رہتا ہوں"۔خیام نے جواب دیا۔

"لیکن تمہیں اپنی صلاحیتوں کو دفن نہیں کرنا چاہیئے"۔

"میرے اندر کون سی ایسی صلاحیت ہے جو شاہ کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہو میں سیاست کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور نہ...."

"نہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ ایک عالم کئی طرح سے خدمات انجام دے سکتا ہے کیا تمہیں یاد ہے کہ میں، تم اور نظام جب یہاں پڑھتے تھے تو ہم نے ایک عہد کیا تھا"۔؟

"ہم ارے وہ محض طالب علموں کا عہد تھا...."

"ہم نے عہد کیا تھا کہ ہم تینوں میں سے کوئی اگر زندگی میں کامرانی اور بلند مرتبہ حاصل کرلے گا تو وہ اپنے بقیہ دو ساتھیوں کی مدد کرے گا"۔

"یہ ایک احمقانہ خیال تھا"۔

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ آخر یہ خیال احمقانہ کیسے تھا؟"

خیام نے حسن کی طرف غور سے دیکھا اور بولا۔ "تو تم اس لئے نیشاپور آئے ہو"۔؟

"تمہارا خیال بڑی حد تک صحیح ہے"۔ حسن نے جواب دیا۔ "نظام ایسا آدمی نہیں ہے کہ اپنا عہد اور اپنے دوستوں کو بھول جائے"۔

"اسی لئے تم تحفے لے کر آئے ہو"؟

"تحفے تحائف سے معاملات آسان ہو جاتے ہیں"۔ حسن نے فوراً جواب دیا۔ پھر مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ محل چلو"۔

"نہیں".... خیام نے کہا.... "میں شاہ یا اپنے پرانے دوست نظام سے کسی چیز کا طلبگار نہیں ہوں"۔

حسن نے اپنی بات پر مزید اصرار نہیں کیا.... "میں سمجھ گیا۔ اس نے خوش دلی کے ساتھ کہا۔" تم ابھی تک وہی شاعر اور عالم ہو جو دس سال پہلے تھے۔ تم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پھر بھی میرے ساتھ چلو تاکہ ہم تینوں ایک بار پھر اکٹھے ہو سکیں...."

حسن بولتے بولتے اچانک رک گیا۔ اس کی نگاہیں ایک المناک منظر سے دوچار ہو گئی تھیں۔ خون میں لت پت چھ انسانی سر گلی میں لٹکے ہوئے تھے۔ سروں کے پاس ہی دو سرخ ٹوپیاں ٹنگی ہوئی تھیں جن میں سرخ دستے والے خنجر گڑے ہوئے تھے۔ "یہ کیا

ہے"؟ حسن نے حیرت سے پوچھا۔

"ڈاکو"۔

"اور یہ سرخ ٹوپیاں؟"

"قاتلوں کی ہیں"۔

"قاتلوں کی؟"

"ہاں! قاتل فدائین کی۔ پورے ملک میں ان کے خنجر سے کوئی محفوظ نہیں ہے وہ بالکل دیوانے ہیں اور....."

"چلو۔ ہم اس سفاک اور دلگداز منظر سے دور ہو جائیں"۔ حسن نے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں محل جانا ہے"۔

"لیکن میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ"....

"عمر میری بات مانو اور چل کر نظام سے مل لو۔ آخر وہ اپنا پرانا دوست ہے"۔ آخر کار خیام اپنے دوست کے ساتھ شاہی محل جانے پر راضی ہو گیا۔

نظام نے بہت تپاک کے ساتھ اپنے دوستوں کا استقبال کیا۔ اور انہیں اپنی ذاتی رہائش گاہ پر لے گیا جہاں وہ بہت دیر تک گزرے ہوئے دنوں کی باتیں کرتے رہے۔ جب ماضی کا خزانہ خالی ہو گیا تو نظام اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے لگا۔ اس نے اپنی ذمے داریاں اور فرائض بیان کرتے ہوئے کہا کہ دربار کو نااہل لوگوں نے گھیر رکھا ہے۔ ایسے میں اسے دوستوں کی سخت ضرورت ہے تاکہ وہ امور سلطنت بحسن و خوبی انجام دے سکے۔ وہ خیام کی صلاحیتوں اور کارناموں سے اچھی طرح واقف تھا۔

"دربار کے کسی عہدے اور کسی منصب کا نام بتاؤ"۔ اس نے خیام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "وہ منصب فوراً تمہیں سونپ دیا جائے گا"۔

"میں صرف تم سے ملنے آیا تھا۔ خیام نے کہا۔ اگر کبھی تمہیں میری ضرورت محسوس ہوئی تو....."

"ضرورت تو آج اور ابھی ہے"۔ نظام بولا۔ فوراً میرے ساتھ چلو تاکہ ہم دربار

ختم ہونے سے پہلے شاہ سے مل سکیں۔ یہ کہتے ہوئے وہ خیام اور حسن کو ساتھ لے کر دربار کی طرف چل دیا۔

دربار نہایت وسیع اور دلکش تھا۔ اس کے ایک سرے پر شاہ تشریف فرما تھے۔ ان کے پاس ہی ہاتھ میں تلوار لئے ترک محافظ کھڑا تھا۔ اگلی صف میں سرکاری اہل کار کھڑے تھے۔ قالین کے کنارے کنارے چاروں طرف ضرورت مند لوگ، غیر ممالک کے سفیر اور سیاح ایستادہ تھے۔ تمام لوگ اپنے اپنے صوبوں کے لباس میں ملبوس تھے۔ نظام اپنے ساتھیوں خیام اور حسن کو لئے ہوئے آگے بڑھا اور قالین کے ایک کنارے پر جا کر رک گیا۔ شاہ کے دونوں شہزادے ان کے سامنے کھڑے تھے۔ بڑا شہزادہ احمد شاہ کی خدمت میں جواہرات کی تلوار پیش کر رہا تھا۔

"ہمیں کچھ انتظار کرنا ہوگا"... نظام نے کہا۔ "دونوں شہزادوں میں چشمک چلتی ہے۔ بڑا شہزادہ جواہرات کی تلوار اس لئے پیش کر رہا ہے کیونکہ چھوٹے شہزادے مالک نے گزشتہ ہفتے ایک جنگی تلوار شاہ کی نذر کی تھی۔ اگرچہ شہزادہ احمد بڑا ہے اور اس اعتبار سے تاج کا وارث ہے مگر چھوٹا شہزادہ اس کے خلاف سازشیں کرتا رہتا ہے تاکہ باپ کا جانشین وہ خود بن جائے۔ جب شہزادے شاہ کے حضور نذر پیش کر چکے تو نظام نے آگے بڑھ کر شاہ سے حسن کا تعارف کرایا۔ حسن نے قیمتی تحائف شاہ کی خدمت میں پیش کئے جن میں دو رقاصائیں بھی شامل تھیں۔

"اور یہ نیشاپور کا عظیم فرزند خیام ہے۔ علم ہیئت کا ماہر، ریاضی داں، شاعر اور ...."

شاہ نے خشمگیں نگاہوں سے خیام کی طرف دیکھا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم شاہی دربار میں حاضر ہو"؟

"نہیں معلوم ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں"۔ خیام نے کہا۔ "ویسے یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے"۔

"شاہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے"۔ تم مناسب درباری لباس کی بجائے پھٹے

پرانے کپڑوں میں آگئے اور یہاں آکر درباری آداب کی خلاف ورزی کر رہے ہو"۔

"میرے خیال میں آدمی کی اہمیت اس کی صلاحیتوں کی وجہ سے ہوتی ہے لباس کی وجہ سے نہیں۔ لباس تو محض دکھاوا ہے۔ میں اس دکھاوے کا متحمل نہیں ہو سکتا"

"تمہاری دریدہ دہنی گستاخی کی حدود میں داخل ہو رہی ہے"۔

"اس کا مقصد گستاخی کرنا ہرگز نہیں ہے"۔ شہزادہ مالک نے اپنے والد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا"۔ اپنا نظریہ حیات بیان کرنا ہے"۔

شہزادہ احمد نے شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اس آدمی کے الفاظ جس جواب کا تقاضا کرتے ہیں وہ اسے دیا جائے"۔

جواب یقیناً دیا جائے گا"۔ شاہ نے کہا۔ "پورا دربار دیکھے گا کہ میں اس شخص کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں جس کے الفاظ سچائی کی تپش سے دہک رہے ہیں"۔

دربار پر موت کا سا سکوت طاری ہو گیا۔

"میرے قابل تعظیم والد نے مجھے تین باتیں بتائی تھیں اور میں نے یہ باتیں اپنے لڑکوں کو بتا دی ہیں"۔ شاہ نے پختہ آواز میں کہا.... "گھوڑ سواری اچھی طرح کرو۔ تیر سیدھا چلاؤ اور ہمیشہ سچ بولو لہذا اس دربار میں صرف سچائی کا بول بالا ہونا چاہئے"۔ وہ خیام سے مخاطب ہوئے۔ "تم واحد آدمی ہو جس نے ہمیں ہمارا فرض یاد دلانے کی کوشش کی۔ میں آدمی کی حیثیت کا اندازہ اس کے تحفوں سے نہیں بلکہ کردار سے لگاتا ہوں"۔ پھر شاہ نے دربار میں حاضر لوگوں کی طرف دیکھا اور کہا.... "نظام کے علاوہ کون ہے جو مجھ سے اس شاعر کی سفارش کرے"؟

شہزادہ مالک اٹھ کر کچھ کہنا چاہتا تھا مگر امام موافق کی آواز نے اسے خاموش کر دیا۔ "جہاں پناہ! آپ کی خدمت میں میرے تین قابل فخر شاگرد حاضر ہیں۔ نظام حسن صباح اور عمر خیام.... عمر نے شاعری، ہیئت اور ریاضی میں لازوال کارنامے انجام دیئے ہیں۔ وہ دلوں کے حال ۔۔۔ ستاروں کی چال تک سب کچھ بتا سکتا ہے...."

"کیا تم ستاروں کے ذریعہ آنے والے دنوں کا حال بتا سکتے ہو" ؟شاہ نے خیام سے پوچھا۔

"پیشن گوئی کا دعویٰ صرف پیشہ ور جیوتشی اور منجم کرتے ہیں" ۔خیام نے جواب دیا۔" میں اس طرح کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ میں تو صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ ستارے بے پایاں سمندروں اور بے سمت ریگستانوں میں انسان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ان سے وقت کے تعین اور تقویم (کیلنڈر) کی تیاری میں بھی کام لیا جا سکتا ہے" ۔

"کیا ہم اپنی تقویم اسمانی ستاروں کے مطابق تیار کرتے ہیں" ؟شاہ نے دلچسپی کے ساتھ پوچھا۔

"جی ہاں! ماضی کی غلطیوں اور گمراہ کن قیاسات نے ہماری تقویم میں بہت سی خامیاں پیدا کر دی ہیں جن کے سبب ہمارے دنوں اور زندگیوں کا توازن بگڑ گیا ہے ہم آپ کی پیدائش کی سالگرہ نصف ہفتہ تاخیر کے ساتھ مناتے ہیں....."

دربار میں موجود لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا۔ جن لوگوں کے دل میں خیام کی ابتدائی بات چیت سے تکدر پیدا ہو گیا تھا وہ زائل ہو گیا۔ شاہ کے چہرے کے تاثرات بھی خوشگوار معلوم ہو رہے تھے۔

" میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں جہاں پناہ! "..... خیام نے پھر کہنا شروع کیا۔ ہماری نمازوں اور روزوں کے وقت اس وقت شروع ہوتے ہیں جبکہ انہیں ختم ہو جانا چاہئے۔یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم اپنا آئندہ دن گزشتہ دن میں گزاریں" ۔

خیام کے اس آخری جملے پر پورا دربار ہنسی اور قہقہے کی آواز سے گونجنے لگا۔شاہ نے لوگوں کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش کیا پھر کہا..... " عمر خیام! دانش گاہ سینا کے سربراہ امام موافق نے تمہاری زبردست سفارش کی ہے اس لئے میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم تقویم کی تصحیح کر کے گزرے ہوئے دن کو ماضی میں اور آنے والے دن کو مستقبل میں جگہ دو" ۔

"بہت خوب جہاں پناہ بہت خوب" ۔امام موافق نے کہا۔

شاہ نے اپنے قریب کھڑے ہوئے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ما بدولت اس آدمی کو پسند کرتے ہیں"۔ پھر خیام سے بولے۔" مجھے بتاؤ کہ تم کون سا عہدہ چاہتے ہو"۔؟

"کوئی عہدہ نہیں"۔خیام نے مختصر سا جواب دیا۔

نظام نے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔" میرا خیال ہے کہ تمام ضروری ساز و سامان کے ساتھ محل میں ستاروں کے مطالعے کے لئے ایک علیحدہ شعبہ قائم کر کے عمر کو اس کا سربراہ مقرر کر دیا جائے تاکہ وہ یکسوئی کے ساتھ تقویم کی درستگی کا کام کر سکے"

"تمام ضروری سامان مہیا کر کے عمر کو دربار کے وزیر کا عہدہ دے دیا جائے تاکہ ہم اس کے علم و دانش سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں"۔شاہ نے حکم دیا۔

خیام اور نظام مودب انداز میں شاہ کے سامنے جھک گئے۔

حسن نے آگے بڑھ کر کہا۔" ہم ابھی ابھی کچھ نذرانے شاہ کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں اور اب اس سے بھی بیش قیمت تحفہ نذر کرنا چاہتے ہیں"۔یہ کہہ کر اس نے اپنے مسلح محافظوں کو اشارہ کیا۔ مسلح محافظوں نے دو صندوق آگے لا کر رکھ دیئے حسن نے کہا۔" تاج ایران کو دو دشمنوں سے خطرہ لاحق ہے۔ایک دشمن شاہ کا عم زادہ سلیمان ہے اور دوسرا غدار بنداری اور یہاں .... "اس نے صندوق کھول دیئے۔ان دونوں دشمنوں کے سر موجود ہیں جو میں نے خود اپنی تلوار سے اتارے ہیں"۔

شاہ اپنے تخت سے اٹھ کر نیچے آئے اور صندوق کے پاس کھڑے ہو گئے۔انھوں نے تن سے جدا سروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" اے میرے جاہ طلب عم زادہ سلیمان! تم بولتے کیوں نہیں؟ تم اتنے خاموش کیوں ہو؟ کیا تمہاری آنکھیں اب اس تاج کو دیکھ سکتی ہیں جس کی تمہیں ہوس تھی"؟ پھر دوسرے سر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔"شاہ سے ایک غدار کی ملاقات اسی طرح ہونی چاہیئے"۔وہ ہنسے۔

حسن نے شاہ کو خوش ہوتے دیکھ کر کہا۔" ان سروں کو مصری ممیوں کے

انداز میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ آپ چاہیں تو انھیں رکھ سکتے ہیں۔"

"تم نے یہ سر خود اپنے ہاتھوں سے قلم کئے"؟ شاہ نے پوچھا۔

"ہاں! میں نے انہیں کوہ البرز میں اچانک جا لیا تھا"۔ حسن نے جواب دیا۔

شاہ نے نظام کو مخاطب کیا مگر اس طرح کہ دوسرے بھی سن سکیں۔ اس شخص نے ایک ہی جرأت مندانہ وار میں ہمارا آدھا دردِ سر ختم کر دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم باز نطینوں اور سرخ خنجر والے فدائین سے بھی نجات حاصل کر لیں۔ شاید یہ شخص اور اس کے کارنامے اونچے عہدے کے متقاضی ہیں"۔

"جہاں پناہ نے شاہی مہروں، فرمانوں اور تصدیق ناموں کے لئے ابھی تک کسی نگراں کا تقرر نہیں کیا ہے"۔ نظام نے کہا۔

"اس شخص کا تقرر کیا جاتا ہے".... شاہ نے بلا تامل کہا اس کے بعد انہوں نے دربار برخواست کرنے کا اعلان کیا اور امام موافق کو اپنے ساتھ لے کر دربار سے باہر چلے گئے۔

شاہ کے جاتے ہی شاہ کا بھائی طوطش آگے بڑھ کر حسن سے لپٹ گیا۔ "طوطش!" حسن خوشی سے چیخ پڑا۔ "تم مجھے بھولے نہیں ہو"؟ حسن نے کہا۔ پھر دو مسلح سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ تمہارے محافظ ہیں"؟

"ہاں! یہ دونوں میرے ذاتی محافظ ہیں"۔ طوطش نے جواب دیا۔ "ان میں سے ایک یونانی غلام ہے اور دوسرا شامی۔ یہ مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑتے۔ فدائین نے مجھے جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی ہے"۔ یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے۔ اس نے جلدی سے اپنی بات ختم کی۔ "کسی دن دربار آؤ"۔

حسن جذبۂ عقیدت کے ساتھ جھک گیا۔

نظام اب خیام کی طرف رخ کر کے گویا ہوا۔ شاہ کے حکم کی فوراً تعمیل کی جائے گی۔ میں تمہارے لئے ایک تجربہ گاہ کا انتظام کرتا ہوں۔

شہزادہ ملک اپنے استاد کا استقبال کرنے کے لئے بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا....

اسے عمر خیام کو دیکھ کر بہت مسرت ہوئی تھی۔ طوطش ان سب کو ضیافت گاہ میں لے گیا جہاں انواع اقسام کے کھانے پھل سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ عمدہ قسم کی شرابیں اس کے علاوہ تھیں۔

طوطش کے ایما پر خیام نے بوتلوں کی مہر توڑی اور پہلی بوتل سے شراب کے چند قطرے زمین پر گرائے۔ "آدمی مٹی کا پتلا ہے"۔ اس نے کہا۔ "ہم خاک سے بنے ہیں اور آخر میں خاک ہی میں مل جاتے ہیں۔ سو نہایت احترام کے ساتھ ہمیں ان لوگوں کے ہونٹ تر کر دینے چاہئیں جو ہم سے پہلے گزر گئے"۔ اس نے چاندی کے پیالوں میں شراب بھر کر باری باری تمام لوگوں کو دی۔

"اپنے میزبان، عالی مقام طوطش کے لئے"۔ حسن نے کہا اور اپنا پیالہ اوپر اٹھا لیا۔ "خدا انہیں عمر دراز اور مخلص دوست عطا فرمائے"۔ تمام لوگوں نے پیالے اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیئے۔ لیکن طوطش پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ "عمر دراز" کے الفاظ نے اسے وہ دھمکی یاد دلا دی تھی جو کہ سرخ خنجر والے فدائین نے اسے دی تھی۔

"تم یقین کرو گے کہ یہ فدائین.... "اس نے حسن سے کہا.... "میں نے ان کا ایک خنجر اپنے تکیئے میں پیوست پایا۔ انھوں نے ایک ہزار طلائی اشرفیوں کا مطالبہ کیا تھا۔ آخر ہمارا تعلق شاہی خاندان سے ہے۔ ہم ایسے مطالبات کیونکر پورے کر سکتے ہیں؟"

"ہمیں بے خوفی کے ساتھ زندہ رہنا اور عزت کے ساتھ مرنا چاہئے"۔ حسن نے کہا

طوطش پیچھے مڑا اور اس نے کچھ مٹھائیاں اور پھل اٹھا کر ان غلاموں کو دیئے جو اس کی حفاظت پر مامور تھے پھر اس نے خیام کو اشارہ کیا کہ وہ شراب کے پیالے ان محافظوں کو بھی دے۔ "شامی گونگا ہے اس لئے وہ مسکرا کر تمہارا شکریہ ادا کرے گا۔" حسن نے خیام سے کہا۔

شہزادہ مالک نے کہا۔ "فدائین بلاوجہ لوگوں کو مار ڈالتے ہیں۔ وہ کسی آدمی

ے قتل کے بعد بھاگنے کی بجائے مقتول کے وارثوں اور دوستوں کا انتظار کرتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ کہاں سے آتے ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں"۔

"اب انھوں نے ہمارے حضور کو قتل کر دینے کی دھمکی دی ہے"۔ شاہی نقیب نے کہا۔ "مطالبہ پورا نہ ہونے پر انہوں نے آئندہ مہینے کی ایک مقررہ تاریخ کو حضور کے خاتمے کی پیش گوئی کی ہے لیکن میں نے سنا ہے کہ کوئی آدمی اگر مقررہ وقت تک خود کو محفوظ رکھنے میں کسی طرح کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کے بعد وہ لوگ کچھ نہیں کرتے"۔

"مگر کوئی آدمی ان کے مقرر کردہ دن تک خود کو محفوظ رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے"۔ شہزادہ مالک نے انکشاف کیا۔

"میں یہ کامیابی حاصل کرنے والا پہلا شخص ہوں گا"۔ طوطش نے اعلان کیا۔ اس کے بعد اس نے عمر خیام سے پوچھا کہ کیا اس کے پاس ایسی کوئی گھڑی ہے جس میں گھنٹوں کی نشاندہی واضح طور پر کی گئی ہو۔ خیام نے اس کا جواب اثبات میں دیا اور اور یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ یہ گھڑی طوطش کو دے گا۔ اچانک شہزادہ احمد وہاں داخل ہوا اس کا چہرہ نہایت سخت اور سنجیدہ تھا۔ اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی اور سیدھا کھانے کی میز پر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے انکشاف کیا کہ شاہ نے شہزادہ مالک کی والدہ کی جگہ جن کا کچھ روز قبل انتقال ہو چکا ہے ایک اور شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

"انہوں نے اس بار اپنی چوتھی بیوی کا انتخاب اسی شہر نیشاپور سے کیا ہے۔ تاکہ ان کے اس اقدام سے یہاں کے لوگ خوش ہو جائیں"۔

"تم صرف میرا مذاق اڑانا چاہتے ہو"۔ شہزادہ مالک نے احتجاج کیا.... "ورنہ میری والدہ شاہ کو بہت عزیز تھیں اور ان کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا"۔

"چوتھی بیوی کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ میری والدہ زرارہ پہلی بیوی ہونے کے ناطے ہمیشہ ملکہ رہیں گی۔ شاہ اس وقت نظام سے مشورہ کر رہے ہیں۔ وہاں امام موافق بھی موجود ہیں کیونکہ...."

"امام موافق ؟"..... خیام نے حیرت سے کہا۔

" میرا خیال ہے کہ میرے بھائی گورنر کی لڑکی منتخب کریں گے ۔ یہ انتخاب سیاسی اعتبار سے سود مند ثابت ہوگا" ۔ طوطش نے اظہار خیال کیا۔

" نہیں! "..... شاہی نقیب نے بڑی قطعیت کے ساتھ کہا..... " یہ گزشتہ ہفتے کا منصوبہ تھا لیکن آج صبح..... کیا تم نے آج خیال نہیں کیا کہ شاہ دربار سے جاتے وقت امام موافق کو اپنے ساتھ لے گئے تھے ۔ میں نے سنا ہے کہ ان کی بیٹی بہت حسین اور ....

خیام یہ سنتے ہی اپنی جگہ سے اچھل پڑا ۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے شکستہ لہجے میں کہا ۔ "شیریں! شیریں میری محبت میری زندگی ہے..... اس کے بغیر..... وہ اسے کبھی حاصل نہیں کر سکیں گے کیونکہ..... " اس کی آواز کو منادی کرنے والوں کی بلند اور پر شور آواز نے دبا دیا ۔ فوجی سپاہی بیرکوں سے باہر نکلنے لگے ۔ خیام بھی وہاں سے تیر کی طرح نکلا اور گلیوں اور بازاروں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا گیا ۔ اس کے پیچھے پیچھے حسن اور نظام بھی اپنے اپنے گھوڑے دوڑانے لگے لیکن وہ خیام کے گھوڑے کو نہ پا سکے ۔

خیام کا گھوڑا شیریں کے باغ کی چہار دیواری تک پہنچ گیا ۔ "شیریں "! خیام نے پکارا لیکن اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی ۔ کچھ ہی دیر میں حسن اور نظام بھی وہاں پہنچ گئے ۔ " اگر تم نے شیریں تک پہنچنے کی کوشش کی تو شاہ کے سپاہی تمہیں قتل کر ڈالیں گے " ۔ حسن نے خیام سے کہا ۔

" میں نے شاہ کو باز رکھنے کی بہت سعی کی مگر کامیاب نہ ہو سکا ۔ وہ مصمم ارادہ کر چکے ہیں کہ شیریں..... " نظام نے سمجھانے کی کوشش کی ۔

" لیکن وہ میری ہے ۔ وہ میری جان..... میری زندگی ہے! " ۔ خیام نے کہا ۔

" مگر شاہ کے ارادے اور خواہش کے آگے..... " نظام نے کہا ۔

" مجھے یاد ہے تم کہا کرتے تھے کہ آدمی کو وقت کے آگے جھک جانا چاہئے ۔ اسی

طرح جس طرح درخت ہواؤں کے آگے جھک جاتے ہیں "۔ حسن نے کہا۔
"انسان کو وقت کے آگے سر تسلیم ضرور خم کر دینا چاہئے لیکن کسی ایسے بادشاہ کے آگے نہیں جو غلط حرکتیں کر رہا ہوں "..... خیام نے اظہار خیال کیا۔
"خاموش رہو!" حسن نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا..... "سپاہیوں کی آواز آرہی ہے"۔
"محبت کے معاملے اکثر سہل ہو جاتے ہیں مگر دنیا...." نظام نے کہا۔
"لیکن شیریں کو کھو کر میں اپنی دنیا گنوا بیٹھوں گا"۔ خیام بولا۔
"آو چلو۔ اس چیز کو بھول جانے کی کوشش کرو جسے تم حاصل نہیں کر سکتے۔" نظام نے خیام کا بازو پکڑ کر لے جاتے ہوئے کہا۔
"بھول جانا ایک قابل نفرت فن ہے۔ صرف بزدل ہی اس پر عمل کرتے ہیں" خیام نے جواب دیا۔ پھر وہ باغ کے درختوں پر حسرت کی نظر ڈالتا ہوا گھوڑے پر سوار ہوا اور حسن اور نظام کے ساتھ شاہی محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

شاہ کی نئی شادی کی خبر پورے ایران میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ نیشاپور کے لوگ اس بات پر فخر محسوس کر رہے تھے کہ شاہ نے اپنی ہونے والی شریک حیات کا انتخاب ان کے صوبے سے کیا ہے۔ شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ دور دراز کے علاقوں سے لوگ تحفے لے کر پہنچنا شروع ہو گئے۔ شادی کے دن پورے نیشاپور کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔ دلہن کی آراستہ پالکی جب محل کی طرف جانے لگی تو لوگ راستے کے دونوں جانب کھڑے ہو گئے۔ اس امید میں کہ شاید وہ اپنی ہونے والی ملکہ کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔ لیکن ان کی مراد پوری نہیں ہو سکی کیونکہ دلہن دبیز پردوں کے اندر تھی۔

شیریں کنیزوں اور دوسری درباری عورتوں کی معیت میں جیسے ہی محل میں داخل ہوئی ہر طرف موسیقی کی آواز گونجنے لگی۔ قاضی نے سجے ہوئے دربار ہال میں نکاح کی رسم ادا کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو شاہ کی زوجیت میں دیا جاتا ہے۔ آپ کو قبول

ہے ''

شیریں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نگاہیں بھرے ہوئے دربار میں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔

"آپ کو شاہ کی زوجیت میں دیا جاتا ہے۔ آپ کو قبول ہے "۔ قاضی نے اپنا جملہ دہرایا۔ شیریں خاموش رہی اس نے دیکھا کہ شاہ کے قریب اس کا محبوب اس کا عمر کھڑا تھا۔

قاضی نے اپنا جملہ تیسری بار دہرایا۔ آپ کو شاہ کی زوجیت میں دیا جاتا ہے۔ آپ کو قبول ہے "؟

"بولیں، جواب دیں "۔ ایک کنیز نے کہا۔

شیریں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہاں! مجھے قبول ہے "۔

موسیقی کی آواز تیز ہو گئی۔ خیام کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ حسن نے اس کے غم و غصے کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تم دربار سے نہیں جا سکتے "۔

"اس سے شادی کی توہین ہو گی "۔ طوطش نے کہا۔

"شیریں نے دیکھا کہ خیام حسن سے اپنا بازو چھڑا کر باہر جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اب آپ ایران کی ملکہ ہیں۔ شاہ کے سامنے ادب سے سر تسلیم خم کیجئے "۔ نظام نے کہا۔

شیریں اپنی جگہ کھڑی رہی۔

"آگے بڑھئے۔ شاہ کھڑے ہوئے آپ کا انتظار کر رہے ہیں "۔ نظام نے پھر کہا۔

شیریں آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور شاہ کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ شاہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دربار ہال میں کھڑے ہوئے لوگ خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ اس وسیع و عریض ہال میں صرف دو آدمی ایسے تھے جنہوں نے تالیاں نہیں بجائیں اور خاموش کھڑے رہے۔ ان میں سے ایک ملکہ زاردہ تھی اور دوسرا شہزادہ احمد۔

عمر خیام نے اپنے دکھ کو رات کے تاریک آسمانوں میں چھپانے کی کوشش کی اس نے اپنی تجربہ گاہ کے مینار سے ستاروں کا مطالعہ کیا اور ایک نئے تقویم کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ خود کو شراب کے پیالے میں غرق کر دیتا۔ اور پھر اپنی ذہنی و قلبی کیفیات کا اظہار اپنے شعروں میں کرتا۔

ایک دن نظام نے آکر اس سے کہا۔ "میں تمہارے لئے ایک چیز لایا ہوں"۔ پھر اس نے تہہ کیا ہوا ایک کاغذ خیام کی طرف بڑھایا۔ "میں نے شادی کے بعد آج پہلی بار اسے دیکھا ہے"۔

خیام نے مہر توڑ کر کاغذ کی تہہ کو کھولا مگر قبل اس کے کہ وہ اسے پڑھتا نظام نے کہا۔ "میں تمہارے لئے ایک خوشخبری لایا ہوں۔ میں نے شاہ کو بالآخر اس بات پر آمادہ کر لیا ہے کہ وہ تمہیں شادی کی تقریب سے غیر مہذب طریقے سے چلے آنے پر معاف کر دیں۔ اس طرح کی حرکتیں خطرناک ہوتی ہیں اور....."

"اگر شاہ سچائی کو پسند کرتے ہیں تو انہیں سمجھنا چاہیئے کہ آدمی دل کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے"۔

نظام نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ وہ خیام سے بحث کرنا نہیں چاہتا تھا۔ "تمہیں معاف کر دیا گیا ہے۔ دربار میں ایک بار پھر تمہیں خوش آمدید کہا جائے گا"۔

خیام نے اس بات کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ شیریں کا پیغام پڑھنے لگے۔ اس نے لکھا تھا:

"یہ میری دلی خواہش کے خلاف ہے پھر بھی میں تم سے یہی کہوں گی کہ مجھے بھول جاؤ۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر مجھ سے ممکن ہوا تو میں بھی تمہیں بھولنے کی کوشش کروں گی۔ خدا تمہیں خوشیاں نصیب کرے"۔

"بھول جاؤ" ۔ خیام نے کہا۔ "یہ کہنا کتنا آسان ہے۔ کبھی کبھی دل ایسی بات کہتا ہے جسے دماغ سوچنے سے بھی انکار کر دیتا ہے۔ میں نے اسے چاہا اس سے محبت کی یہ

میری پہلی محبت تھی اور پہلی محبت کبھی نہیں مرتی"۔

"کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا"۔ نظام نے کہا۔

"ہماری محبت بہت سچی اور گہری تھی۔ تم اسے دماغ کا خلل کہتے ہو۔ میں اب بھی دل کی تمام گہرائیوں سے اسے چاہتا ہوں"۔ خیام نے کہا۔ اور چاندی کا پیالہ اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔

"محبت کی راہ کانٹوں سے بھری ہوتی ہے۔ کیا تم اسی محبت کی وجہ سے دنیا کی تمام خوشیوں سے منہ موڑلو گے؟ ماضی کو بھول جاؤ۔ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ دنیا میں بہت ساری دیگر نعمتیں اور بہت ساری عورتیں ہیں"۔ نظام نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"بہت ساری عورتیں!" خیام نے غصے سے کہا۔ "دوسروں کی طرح مجھ سے یہ نہ کہو کہ عورتیں محض مردوں کے عیش وآرام کے لئے بنائی گئی ہیں۔ یہ نہ کہو کہ ان کی حیثیت بے روح اور بے وفا مخلوق کی ہے۔ نہیں نہیں"۔

"تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ ہو سکتا ہے صحیح ہو مگر یقینی طور پر دنیا میں دوسری عورتیں بھی ہیں"۔ نظام نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے لئے اور شراب بھیج دوں گا۔ اور ہاں! حضور طوطش تمہیں یاد کر رہے تھے۔ وہ مسلح محافظوں کی موجودگی کے باوجود پریشان ہیں فدائین نے انہیں آج نصف شب تک کا وقت دیا ہے"۔

خیام نے پیالہ ہونٹوں تک لے جاتے ہوئے کہا۔ "میں آج انہیں اپنی گھڑی دیدوں گا"۔

"نصف شب گزر جانے کے بعد وہ خود کو خوش قسمت خیال کریں گے"۔ نظام نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"تجربہ گاہ بھی ہے اور شاہی ہیئت داں اندر ہے" خیام نے سنا۔ نظام کمرے کے باہر کسی سے کہہ رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا۔ ایک کنیز اور ایک غلام اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کے پیچھے ایک اور خوبصورت کنیز تھی۔ جو اپنے ہاتھوں میں

شراب کی صراحی اٹھائے ہوئے تھی۔اس نے آگے بڑھ کر خیام کا پیالہ بھر دیا۔ خیام نے اسے دیکھا۔وہ گداز جسم اور بڑی بڑی آنکھوں والی ایک حسین کنیز تھی۔

"حضور نظام نے یہ کنیز آپ کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کی ہے"۔ غلام مرد نے کہا۔"اس کا نام ایفا ہے"۔

"شراب کے لئے نظام کا شکریہ ادا کر دو اور دوسرا تحفہ قبول کرنے سے معذرت"۔ خیام نے کہا۔

"نہیں حضور مجھے واپس نہ کیجئے"۔ کنیز نے کہا۔" میں ایک بربر لڑکی ہوں اور بربر عورت سے زیادہ وفادار کوئی اور عورت نہیں ہوتی۔ میں پوری وفاداری اور فرماں برداری کے ساتھ آپ کی خدمت کروں گی۔ کسی بیوی سے بھی زیادہ کیونکہ مجھے اس کی تربیت دی گئی ہے"۔

خیام نے چاندی کا پیالہ ہونٹوں سے لگالیا۔

"اگر آپ مجھے رد کریں گے تو وہ لوگ مجھے زدو کوب کریں گے"۔ کنیز نے پھر کہنا شروع کیا۔"آپ مجھے قبول کرلیں۔ میں اس جگہ کو جنت میں تبدیل کر دوں گی"۔ وہ خیام کے آگے جھک گئی۔اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپکنے لگے۔ خیام کچھ دیر اسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بازوؤں سے پکڑ کر اسے اوپر اٹھایا اور آنکھوں سے آنسو پونچھ دیئے غلام مرد اور بوڑھی کنیز مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے۔

رات آئی تو محل کے درو دیوار پر خوف کے سائے لہرانے لگے۔ تمام پھاٹکوں اور دروازوں پر مسلح دستے تعینات کر دیئے گئے۔ طوطش اور اس کے بااعتماد دوست ایک کمرے میں اکٹھا ہو گئے تاکہ فدائین سے مقابلہ کر سکیں۔وہ سب فدائین کا انتظار کرتے رہے۔وقت گزرتا رہا۔

شہزادہ مالک نے خیام کی بنائی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" آدھی رات گزر چکی ہے۔ کچھ ہی دیر میں تاریخ بدل جائے گی"۔

"تمام لوگوں کو ہوشیار کر دیا جائے۔دروازوں اور کھڑکیوں کے پہرے سخت

کر دیئے جائیں"۔ شاہی نقیب نے آواز لگائی۔ تمام لوگوں نے اپنی اپنی تلواریں اور خنجر نکال لئے۔

شہزادہ احمد نے کہا۔ "ہم لوگ چاروں طرف سے گھیرا ڈال لیں"۔

"ہاں! آہنی گھیرا"۔ کسی نے کہا۔

سب لوگ گھڑی کی طرف دیکھنے لگے۔

"اور کتنی دیر ہے"؟... گھبرائے ہوئے لہجے میں طوطش نے پوچھا۔

"صرف چند لمحے اور"۔ خیام نے جواب دیا۔

"نصف شب گزر گئی"۔ شاہی نقیب نے صدا لگائی۔

"نصف شب!" طوطش نے پر مسرت لہجے میں دہرایا۔ پھر ذرا تیز آواز میں بولا۔ "وہ نام نہاد بہادر قاتل کہاں ہیں؟"

اس کے ساتھ ہی گونگا شاہی محافظ چیخنے لگا۔ اس نے اپنے سر سے بلند طرہ اٹھا کر فدائین کی لال ٹوپی دکھائی پھر خنجر نکال کر اس کا لال ہتھا چوما اور طوطش کی پشت میں گھونپ دیا۔ اس نے لگاتار کئی وار کیے۔ تمام لوگ ہکا بکا اسے دیکھتے رہ گئے۔ بالآخر خیام نے آگے بڑھ کر اسے طوطش سے الگ کیا۔ دوسرے ہی لمحے حسن نے اپنی تلوار سے شاہی محافظ پر وار کیا۔ شاہی محافظ نیچے گر گیا۔ گرتے وقت اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

طوطش بھی بے ہوش ہو کر دروازے کے قریب گر پڑا۔ خیام اور درباری معالج نے جھک کر اسے دیکھنا شروع کر دیا۔ طوطش کو کئی کاری اور گہرے زخم آئے تھے۔ شاہی معالج اور خیام نے اندازہ لگایا کہ طوطش زخموں کی تاب نہیں لا سکے گا۔ کچھ ہی دیر میں ان لوگوں کا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ شاہ فارس کے بھائی طوطش زخموں کی تاب نہ لا کر اس دنیا سے چل بسے۔

یہ خبر کہ "فدائین نے محل ہی میں داخل ہو کر شاہ کے بھائی کو قتل کر دیا ہے" دیکھتے دیکھتے پورے شہر میں پھیل گئی۔ دوسری صبح شہر کے پھاٹک کے قریب قاتل کا

سر مع اس کی لال ٹوپی کے لٹکا دیا گیا۔ حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ جو شخص قاتل کی سی لال ٹوپی پہننے والے کسی آدمی کو پکڑ کر لائے گا اسے بیس طلائی اشرفیاں انعام دی جائیں گی۔ اس اعلان کے ساتھ ساتھ یہ افواہ بھی سارے شہر میں پھیل گئی کہ ایک گھوڑ سوار شاہ کے پاس حملے کی اطلاع دینے آیا ہے۔ یہ افواہ غلط نہیں تھی۔ باز نطینی فوجیں ایران کی سرحد کے اندر داخل ہو چکی تھیں۔ شاہ نے فوراً اپنے مشیروں کا اجلاس طلب کر لیا۔

شاہی پیغامبر نے جب خیام کو متوقع حملے کی اطلاع دی تو اس نے کہا۔ "میں فوراً پہنچ رہا ہوں"۔

ایفا دوڑ کر خیام کا درباری لباس لے آئی۔ خیام نے اسے پہنا اور روانہ ہو گیا۔ وہ جیسے ہی محل میں داخل ہوا اس کی نظر شیریں پر پڑی جو اس وقت محل کی ایک روش پر ٹہل رہی تھی۔ دونوں نے ٹھٹھک کر ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر خیام خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ خیام جب شاہ کے پاس پہنچا تو شاہ شہزادہ مالک، نظام اور حسن سے مشورے کر رہے تھے۔ فوراً ہی بعد شہزادہ احمد اور فوجی جرنیل بھی وہاں پہنچ گئے۔

"باز نطینی ہماری سرحدوں میں داخل ہو گئے ہیں۔ ان کے سپاہی تربیت یافتہ ہیں"۔ پیغامبر نے کہا۔

"ان کی قیادت کون کر رہا ہے"؟ شاہ نے دریافت کیا۔

"ان کا شہنشاہ رومانوس.... پیغامبر نے جواب دیا۔

"وہ جوان اور ناتجربہ کار ہے"۔ نظام نے کہا۔

"لیکن اس نے اپنے سپاہیوں کے سامنے قسم کھائی ہے کہ وہ فتح حاصل کر کے رہے گا"۔ پیغامبر نے کہا۔

"یہ محض اس کی خوش فہمی ہے۔ وہ ہماری طاقت سے اچھی طرح واقف ہے"۔ شاہ نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"آنے دو۔ اسے آنے دو"۔ شہزادہ احمد نے بلند آواز میں کہا۔ "اس کے راستے

میں چٹانوں کی طرح مضبوط شہر ہیں.... انہیں عبور کرنے میں اسے وقت لگے گا اور تب تک .... ہماری بہادر فوجیں ان باز نطینیوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیں گی.... آخری فتح یقیناً ہماری ہو گی"۔

"مگر نجومی کہتے ہیں کہ جنگ ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو گی"۔ شاہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"حضور عالی".... خیام نے شاہ کو مخاطب کیا۔ "اگر میری حکمت عملی پر عمل کیا جائے تو دشمنوں کو یقیناً شکست ہو گی"۔

شہزادہ احمد نے خفگی کے ساتھ خیام کی طرف دیکھا۔ "یہ بکواس ہے تمہارا فوجی حکمت عملی سے کیا تعلق؟"

خیام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن شہزادہ مالک خاموش نہیں رہ سکا۔ اس نے اپنے استاد کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔ "عمر خیام نے گھوڑ سوار فوج کی قیادت کی ہے اور انتہائی خوفناک جنگ میں دشمنوں پر غلبہ پایا ہے"۔

"ہمیں فی الحال سپاہیوں کی ضرورت ہے"۔ شہزادہ احمد نے تیز آواز میں کہا۔

"سپاہیوں سے زیادہ ہمیں صحیح منصوبہ بندی کی ضرورت ہے"۔ خیام نے شاہ سے کہا۔ "ہمیں فوراً دشمنوں پر حملہ کر دینا چاہیئے"۔

"حملہ!".... شہزادہ احمد نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "باز نطینیوں کی تعداد ہم سے چار گنی زیادہ ہے۔ ایسی صورت میں حملہ کرنا شکست کی حکمت عملی ثابت ہو گی"۔

"عمر خیام کی باتیں غور سے سنی جائیں"۔ شاہ نے آواز بلند کی۔

خیام نے ایک نقشہ کھول کر اپنے منصوبے کی تفصیلات بیان کرنا شروع کریں۔ "ہمیں رات کے وقت باز نطینیوں پر اچانک حملہ کر دینا چاہیئے۔ اچانک حملہ بجائے خود ایک ہتھیار ہے۔ ان کے سپاہ کرائے کے ہیں اس لئے وہ بد دل ہو کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ پھر ہم آسانی کے ساتھ شہنشاہ رومانوس کو گرفتار کر سکتے ہیں"۔

شاہ نے نقشہ اپنے ہاتھوں میں لے کر خیام کے منصوبے پر غور کرنا شروع کر

دیا۔" اس ستارہ شناس کی تجویز یہ ہے کہ ہم اپنے سپاہیوں اور گھوڑوں کے ساتھ سمندر پار کے حملہ کریں ..." شہزادہ احمد نے خیام کی تجویز کرد کرتے ہوئے کہا۔

"حضور عالی!" خیام نے شاہ کو مخاطب کیا۔" اگر آپ علم دیں تو ہزاروں کشتیاں اور بجرے ساحل پر منتظر پائیں گے"۔

"کیسے"... شاہ نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کے پاس تربیت یافتہ کبوتر ہیں جو ملک کے دور دراز علاقوں تک پیغام رسانی کا کام کرتے ہیں۔ یہ کبوتر آپ کا پیغام ساحلی شہروں تک پہنچا دیں گے اور آپ کی فرمانبردار رعایا فوجوں کے پہنچنے سے پہلے ہی ساحل پر کشتیوں اور بجروں کے ساتھ موجود ہو گی۔ جرأت اور غیر متوقع حملہ ہماری عددی کمی کو پورا کر دے گا۔" خیام نے وضاحت کی۔ چہار سو خاموشی طاری ہو گئی۔ شاہ نے اپنے مشیروں کی طرف دیکھا پھر گویا ہوئے۔" پیغام رساں کبوتروں کو فوراً اکٹھا کیا جائے۔ اس اثناء میں ہم مجوزہ حکمت عملی پر غور کریں گے"۔

پیغام رساں کبوتر اسی دن شاہ کا پیغام لے کر ہر طرف روانہ کر دیئے گئے۔ شاہ نے خیام سے کہا.... "شام کے وقت دس ہزار گھوڑ سوار میرے ساتھ روانہ ہوں گے۔ دوسرے دستے پہلے ہی روانہ ہو چکے ہیں۔ وہ ہم سے ساحل سمندر پر ملیں گے۔ اگر تمہاری حکمت عملی کامیاب ثابت ہوئی تو فتح یقیناً ہماری ہو گی بصورت دیگر ہمارا ایک بھی آدمی واپس نہیں لوٹے گا۔ ہم نے ایک بڑا خطرہ مول لیا ہے"۔

"جنگ ہمیشہ خطرات سے پر ہوتی ہے"۔ خیام نے کہا" اگر آپ کو میری تجویز کے بارے میں کوئی شبہ ہے تو میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں"۔

"نہیں تمہاری ضرورت یہاں زیادہ ہے"۔ شاہ نے کہا۔" مجھے اندیشہ ہے کہ فدائین یہاں تباہی اور قتل و غارتگری کا بازار گرم کر دیں گے۔ ہوشیار رہنا اور ہر طرح نظام کے ساتھ تعاون کرنا تاکہ میں سکون کے ساتھ جنگ میں حصہ لے سکوں"۔

ایک گوشے میں ملکہ زاردہ اپنے بیٹے شہزادہ احمد کے ساتھ سرگوشی میں مصروف

تھی۔ نظام نے ان کی طرف دیکھ کر شاہ سے کہا۔ "ملکہ زاردہ کو توقع ہے کہ آپ شہزادہ احمد کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے تاکہ وہ تاج وتخت کے وارث کی حیثیت سے... "

" میرے بیٹے ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں.... " شاہ نے نظام کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اور میں نہیں چاہتا کہ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دوں۔

شہزادہ احمد نے کہا۔ " میں شہزادے کی حیثیت سے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے اعلان کرتا ہوں کہ میں اپنے والد گرامی مرتبت شاہ فارس کے ساتھ محاذ جنگ پر جاؤں گا "۔

" یہ کوئی حق نہیں بلکہ اعزاز ہے " ۔ شہزادہ مالک نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں شہزادوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ شاہ نے کہا۔ " انہیں لڑنے دو۔ یہ تلوار جو شہزادہ مالک نے مجھے دی ہے اسے ملے گی جو جیتے گا اور جیتنے والا ہی میرے ساتھ جائے گا ۔ یہ سنتے ہی دونوں شہزادے ایک دوسرے سے شیروں کی مانند دست و گریباں ہو گئے کبھی ایک غلبہ حاصل کر لیتا کبھی دوسرا بالآخر شہزادہ احمد نے شہزادہ مالک کو زیر کر لیا

لوگ چیخنے لگے۔ " حضور عالی! شہزادہ احمد شہزادہ مالک کو ہلاک کر دیں گے " ۔

" میری جگہ لینے والے شخص کو کمزور نہیں ہونا چاہئے بہتر یہی ہے کہ وہ ابھی ختم ہو جائے " ۔ شاہ نے کہا۔

ملکہ زاردہ کی آواز مسلسل گونج رہی تھی۔ " ہلاک کر دو۔ مالک کو ہلاک کر دو " ۔ اس نے ایک خنجر اٹھا کر اپنے بیٹے کی طرف پھینکا لیکن شاہ نے آگے بڑھ کر اس خنجر پر قبضہ کر لیا۔ تاکہ شہزادہ احمد اسے نہ لے سکے۔ شہزادہ احمد دھات کا بنا ہوا ایک لیمپ اٹھا کر شہزادہ مالک کی طرف بڑھا۔ مگر قبل اس کے کہ وہ اس سے وار کرتا شہزادہ مالک نے اسے اوپر اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ شہزادہ احمد کا سر زخمی ہو گیا اس نے فرش سے اٹھ کر مالک پر جوابی حملہ کرنا چاہا مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ شہزادہ مالک لڑائی میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بازو فاتحانہ انداز میں لہرائے اور آگے بڑھ کر شاہ کے ہاتھوں کا بوسہ لیا۔ شاہ فخر کے ساتھ مسکرائے۔ ملکہ زاردہ نے جھک کر اپنے

بیٹے کے ہونٹوں سے شراب کا پیالہ لگا دیا مگر وہ اسے پی نہ سکا۔ ملکہ نے تعاون کے لئے ادھر ادھر دیکھا۔ حسن نے ملازموں کی مدد سے شہزادہ احمد کو اٹھایا اور ملکہ زاردہ کے محل خاص میں پہنچا دیا۔

کچھ دیر کے بعد جب احمد ہوش میں آیا تو حسن نے کہا۔ "آپ کا بھائی شہزادہ مالک اب شاہ کا جانشین ہے۔ آپ ہار چکے ہیں لیکن ....."

"میں نے بار بار تم سے کہا کہ اسے ہلاک کر دو۔" ملکہ نے شہزادہ احمد سے کہا۔ شہزادہ احمد خاموش رہا۔

"آپ سب کچھ ہار چکے ہیں پھر بھی اپنے والد کا تاج حاصل کر سکتے ہیں"۔ حسن نے کہا۔

ملکہ زاردہ نے سوالیہ نظروں سے حسن کی طرف دیکھا۔

"جس دن میں محل میں داخل ہوا تھا اس دن میں نے شاہ کو دو قیمتی سروں کا تحفہ پیش کیا تھا"۔ حسن نے کہا۔

"ہاں ہاں! مجھے یاد ہے"۔ ملکہ نے کہا۔

"ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ شہزادہ احمد تخت و تاج کے وارث بنیں۔ وہ اس مقصد کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ بشرطیکہ ان سے دوستی اور تعاون کا وعدہ کیا جائے۔ طوطش کے انتقال کے بعد صرف شہزادہ مالک ہی رہ گیا ہے اس کے بعد راستہ بالکل صاف ہے"۔ حسن نے کہا۔

ملکہ زاردہ کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔

"شاہ اور مسلح فوجوں کے یہاں سے رخصت ہو جانے کے بعد ہم مزید بات چیت کریں گے۔ اسی وقت میں سب کچھ بتا دوں گا"۔ حسن یہ کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

شاہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ محاذ جنگ کے لئے روانہ ہوئے ان کے ساتھ ساتھ شہزادہ مالک بھی تھا۔

شاہ کے اندیشے کے مطابق فدائین نے واقعی ان کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی مگر نظام اور اس کے ماتحتوں نے انہیں ناکام بنا دیا۔ چار ہفتوں میں چھ فدائین پکڑے گئے اور انہیں سزا دی گئی۔

"اور آج"۔ نظام نے خیام کی تجربہ گاہ میں حسن کے سامنے انکشاف کیا۔ "ہم نے دو مزید فدائین گرفتار کیے ہیں۔ میں نے ان کی سزا کا حکم جاری کر دیا ہے"۔

"تم قانون پر بہت سختی کے ساتھ عمل کرنا چاہتے ہو"۔ حسن نے کہا۔

"یہ میرا فرض ہے اور اپنے ملک اور شاہ سے وفاداری کا تقاضا بھی یہی ہے"۔ نظام نے کہا۔

"موجودہ حالات میں اس سے زیادہ کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا"۔ خیام نے خیال ظاہر کیا۔ "لیکن ہم لوگوں کو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ ان فدائین کو کون بھیجتا ہے اور وہ کہاں سے آتے ہیں...."

"اس سے کیا فرق پڑے گا؟" حسن نے سوال کیا:

"بہت زیادہ فرق پڑے گا"۔ خیام نے جواب دیا۔ نظام نے بھی سر ہلا کر اس کی تائید کی اور وہاں سے کسی ضروری کام کے لئے رخصت ہو گیا۔ ایفا نظام کے لئے دروازہ کھولنے کے لئے آئی تو حسن نے اسے غور سے دیکھا پھر بولا۔ "یہ کنیز کافی پر کشش ہے۔ میں اسے خریدنا چاہتا ہوں" یہ سن کر ایفا سہم گئی۔ حسن نے پھر کہا۔ "تم اس کی جو بھی قیمت مانگو میں ادا کر دوں گا۔ اسے مجھے دے دو۔ میں اس کے بدلے میں تمہیں دو یونانی اور ایک مصری کنیز دوں گا"۔

خیام نے حسن کو دیکھا اور نرمی سے بولا۔ "ایفا میری وفادار ہے"۔

"میں انتظار کروں گا۔ اس وقت تک جب تک کہ تم اس سے اکتا نہ جاؤ یا پھر کسی دن جب تمہیں کسی ایسی چیز کی ضرورت ہو گی جسے تم واقعی چاہتے ہو تو میں تم سے اس کا سودا کر لوں گا"۔ حسن یہ کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ایفا حسن کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس نے اس کے لئے دروازہ بھی نہیں کھولا۔ جب حسن کے قدموں

کی چاپ معدوم ہو گئی تو ایفا نے خیام سے کہا۔" میں ایک ایسے بوڑھے آدمی کو جانتی ہوں جو پہلے فدائین کے گروہ میں شامل تھا اور اب ایک غار میں رہتا ہے۔اسے بہت سے راز معلوم ہیں مگر موت کے خوف سے وہ چھپا رہتا ہے۔غلاموں کے بازار میں مجھے ایک لڑکی نے اس کے بارے میں بتا دیا تھا۔وہ اس کے لئے کھانا لے جاتی تھی۔اس بوڑھے کا نام یوسف ہے"۔

"تم نے مجھے اس کے بارے میں پہلے کیوں نہیں بتایا"۔خیام نے پوچھا۔

"اس لئے کہ کسی غلام یا کنیز کو ایسی باتوں کے لئے سزا بھی دی جا سکتی ہے.... اور اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ میرا خیال رکھتے ہیں ورنہ آپ نے اس وقت مجھے حسن کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہوتا"۔

گھبراؤ نہیں۔میں تمہیں کبھی فروخت نہیں کروں گا حسن تمہیں کبھی حاصل نہیں کر سکتا"۔

"میرے آقا! آپ میرے جسم وروح کے مالک ہیں میں آپ کی کنیز ہوں۔اکثر لوگ اپنی کنیزوں سے شادی بھی کر لیتے ہیں.... میرا مطلب ہے ایک دن جب آپ سوئے ہوئے تھے تو میں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ آپ کا یہ طلائی بازو بند میرے گلے میں حمائل ہو جائے یہ حسین زیور میرے گلے میں ہوتا تو لوگ سوچتے کہ آپ اپنی بربر کنیز سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔اس سے یہ ظاہر ہوتا کہ آپ کا دل کسی محل میں رہنے والی کے لئے نہیں تڑپ رہا ہے اس طرح باتیں بنانے والوں کی زبانیں خاموش ہو جاتیں"۔

خیام ایفا کو گھورتا اور کچھ سوچتا رہا۔

ایفا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔"ایک دن ملکہ زاردہ ایک خوبصورت کنیز سے آپ کی شادی کی باتیں کر رہی تھیں۔اس پر ملکہ شیریں نے ان سے کہا کہ عمر خیام کے پاس ایک کنیز پہلے سے موجود ہے جس کی بھاری قیمت ادا کی گئی ہے۔ملکہ زاردہ نے کہا کہ بیوی کنیز سے بہتر رہے گی۔کسی نے انہیں جواب دیا کہ کنیز بھی وہ

سب کچھ کر سکتی ہے جو کہ ایک بیوی کرتی ہے کچھ عورتیں یہ بات سن کر ہنسنے لگیں۔ کچھ سنجیدہ ہو گئیں۔ ملکہ زاردہ نہایت بے رحم عورت ہے۔ محل کی عورتیں اسے ناپسند کرتی ہیں۔ کل ایک خاتون نے کہا کہ شاہ کی واپسی کے بعد یہاں کافی تبدیلیاں آئیں گی ملکہ زاردہ نے مسکراتے ہوئے کہا کہ شاہ واپس آئیں یا نہ آئیں یہاں تبدیلیاں ضرور آئیں گی۔ سب لوگ دیکھیں گے کہ ملکہ زاردہ حکومت کر رہی ہے۔ ملکہ زاردہ جس واحد شخص کو پسند کرتی ہیں وہ آپ کا دوست حسن ہے۔ میں نے اکثر انہیں باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے اور...."

خیام محل کی باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ وہ بوڑھے یوسف کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ "مجھے اس آدمی کے بارے میں بتاؤ جو خوف کے مارے غار میں چھپا رہتا ہے کیا اس کا نام یوسف ہے"۔؟

"ہاں! میرے آقا"۔

"اور اس لڑکی کا نام کیا ہے جو اس کے لئے کھانا لاتی ہے"۔

"لیلیٰ!"

"لیکن وہ اس کے لئے کھانا کیوں لاتی ہے"؟

"اس لئے کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے"۔

"کیا وہ غار میں روزانہ جاتی ہے"؟

"جب بھی موقع ملتا ہے ویسے اکثر وہ رات کے وقت وہاں جاتی ہے۔ آج بھی وہ وہاں جائے گی۔ اگر آپ چاہیں تو وہ آپ کو بھی اپنے ساتھ لے جائے گی"۔

"ٹھیک ہے آج رات"۔

غروب آفتاب کے بعد خیام، ایفا اور لیلیٰ کی معیت میں روانہ ہوئے۔ گلیوں اور ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گزر کر وہ اس پہاڑی پر پہنچے جس کے ایک غار میں یوسف رہتا تھا۔ غار کے دہانے پر پہنچ کر لیلیٰ نے آواز دی۔ "یوسف میں کچھ بااعتماد دوستوں کو لے کر آئی ہوں"۔ اس کے بعد لیلیٰ تاریک غار میں اتر گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایفا اور

خیام بھی اندر چلے گئے۔ غار کے اندر ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ جل رہا تھا جس کے پاس ہی یوسف بیٹھا تھا۔ لیلیٰ، ایفا اور خیام اس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

"یہ دوست تمہاری مدد کرنے آئے ہیں۔ ان سے تمام باتیں کہہ دو"۔ لیلیٰ نے یوسف سے کہا۔ یوسف نے خیام کو گھور کر دیکھا پھر آہستہ سے بولا۔ "اب تم جسے دیکھ رہے ہو وہ ایک تباہ حال آدمی ہے۔ میں کبھی ملک کا بہترین کاریگر تھا۔ لوگ میری عزت کرتے تھے اور مجھے ہر طرح آسائش میسر تھی۔ لیکن اب یہ تاریک غار میرا مقدر ہے میں اس میں کسی جانور کی طرح زندہ ہوں اس لئے کہ.... " اس نے ایک پتھر کے اوپر سے لال ہتھے والا ایک خنجر اٹھا کر پاس رکھی ہوئی لکڑی میں پیوست کر دیا۔ "اس لئے کہ میری زندگی اس خنجر نے تباہ کر دی"۔ یوسف نے آہستہ آہستہ اپنی زندگی کی پوری داستان دہرائی کہ کس طرح وہ اپنا پیشہ چھوڑ کر فدائین کے گروہ میں شامل ہوا اور فدائین نے اسے کیا کیا سبز باغ دکھائے" پھر ایک دن وہ آیا جب ہم سے کہا گیا کہ ہمارے خلیفہ یعنی فدائین کے سرغنہ کو پوری دنیا پر حکومت کرنی چاہیئے کیونکہ خدا کا منشاء یہی ہے ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم چاروں طرف بکھر جائیں اور اس کے لئے راستہ ہموار کریں ان تمام لوگوں کو قتل کر دیا جائے جو ہمارے خلیفہ کی راہ میں رکاوٹ ہوں۔ ہمیں حشیش اور دوسری نشہ آور اشیاء پلا کر قتل کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ اگر کسی نے انکار کی جرأت کی تو سب سے پہلے اسے ہی قتل کر دیا جاتا تھا۔ میں نے قتل کرنے سے انکار کر دیا اور معجزانہ طور پر قتل ہونے سے بچ گیا۔ اور اب یہ اندھیرا ہی میرا گھر ہے مجھے ہر جگہ تلاش کیا جا رہا ہے اور...."

خیام نے یوسف کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ فدائین کا سرغنہ کہاں رہتا ہے اور فدائین کہاں سے آتے ہیں؟"

فدائین کے کئی پوشیدہ ٹھکانے ہیں اور یہ ٹھکانے شام اور کردستان تک پھیلے ہوئے ہیں مگر ان کا سب سے بڑا مرکز الموت ہے جہاں ان کا سرغنہ رہتا ہے۔ اس کا قیام پہاڑوں کے درمیان ایک پرانے قلعے میں ہے اگر کوئی اجنبی وہاں پہنچ جائے تو وہ زندہ

واپس نہیں آتا"۔

"اگر کوئی شاہی ہیت داں ستاروں کے مطالعے کے لئے اس وادی میں جائے تو کیا وہ اسے بھی قتل کر دیں گے"؟

"وہ اس کے جسم کو کاٹ کر سات حصوں میں تقسیم کر دیں گے۔سات کا عدد ان کے ہاں بہت اہم ہے۔ہر کام سات سے شروع کیا جاتا ہے۔ان کے سات محاورے ہیں جن میں سے ہر ایک میں سات لفظ ہیں۔تم نے دیکھا ہو گا کہ ان کے خنجر کے ہتھے میں جو حلقے ہیں ان کی تعداد بھی سات ہے۔یہ سات حلقے سات احکامات اخوت کی علامت ہیں"۔اس کے بعد یوسف نے چاندی کا ایک پیالہ دکھایا جس پر اس نے اپنے ہاتھوں سے نقاشی کی تھی۔پیالہ دکھانے کے بعد اس نے خیام سے کہا کہ وہ اسے بیچنا چاہتا ہے تاکہ لیلیٰ کی آزادی خرید سکے۔

"کل تمہاری لیلیٰ تمہیں واپس مل جائے گی۔میں یہ پیالہ اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔اسے فروخت کر کے جو رقم حاصل ہو گی اس سے میں تمہاری لیلیٰ کو اس کے آقا سے نجات دلاؤں گا۔تاکہ وہ ہمیشہ کے لئے تمہاری ہو جائے۔اگر کچھ رقم اس کے بعد بچ گئی تو وہ تم لوگ اپنے ساتھ لے جانا"۔خیام نے کہا۔

دوسرے دن خیام وہ پیالہ لے کر نظام کے پاس گیا۔نظام نے اسے چالیس طلائی اشرفیوں کے عوض خرید لیا۔خیام نے نظام اور حسن کو اپنی مہم کے بارے میں بتایا لیکن اس نے غار کی جائے وقوع اور لیلیٰ و یوسف کی شناخت کو ان لوگوں سے پوشیدہ رکھا۔

"الموت کی اونچی پہاڑوں کے درمیان ان کا قلعہ ہے۔یہاں لوگوں کو قاتل بننے کی تربیت دی جاتی ہے"۔خیام نے بتایا۔

"شاہ کی فوجیں اس ضلع سے زیادہ دور نہیں ہیں"۔نظام نے کہا۔"ہم لوگ وہاں اپنے سپاہی بھیج سکتے ہیں....."

"قلعہ صدیوں سے قائم ہے لیکن اسے کبھی طاقت کے ذریعہ فتح نہیں کیا جا سکا"

خیام بولا۔ جہاں فوج داخل نہیں ہو سکتی وہاں ایک آدمی داخل ہو سکتا ہے ہر کسی کو یہ معلوم ہے کہ میں نئی تقویم کی تیاری کے سلسلے میں مشاہدہ و مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس مقصد کے لیے مجھے بلند مقامات پر بھی جانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ جیسے ہی میں اس کنیز کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور وہ اور اس کا محبوب دونوں سمندر پار کے سفر پر روانہ ہو جائیں گے میں الموت کو چل پڑوں گا"۔

"تمہیں اس کی ہمت نہیں ہو گی۔ فدائین کے خنجر تمہیں نہیں بخشیں گے"۔ حسن نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں الموت ضرور جاؤں گا اور وہاں جا کر فدائین کے راز معلوم کروں گا۔ اس کے بعد میں شاہ کو تمام باتوں سے مطلع کروں گا"۔

محل میں یہ خبر فوراً مشہور ہو گئی کہ عمر خیام اپنے کام کے سلسلے میں پہاڑوں پر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ ایفا نے خیام کی بہت منت سماجت کی کہ وہ اسے بھی اپنے سفر میں ساتھ لے چلے۔ "میں جانتی ہوں کہ پہاڑوں پر سفر کس طرح کیا جاتا ہے"۔ ایفا نے کہا۔ "میں ہر طرح آپ کا خیال رکھوں گی اور آپ کی حفاظت کروں گی"۔

"تمہیں ساتھ لے جانا ممکن نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب میں واپس آؤں تو تم میرا انتظار کر رہی ہو"۔

"نہیں میرے آقا۔ میرا دل دھڑک رہا ہے۔ عورت کا دل بہت سی ایسی باتیں بتا دیتا ہے جسے عقل نہیں سمجھ سکتی"۔ ایفا خاموش ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ہر حال میں اسے اپنے آقا کا حکم ماننا ہے۔ لہٰذا وہ خیام کے سامان کی تیاری میں لگ گئی۔

دروازہ کھلا اور ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ خیام نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ شیریں کی کنیز تھی۔ "آج رات کا کھانا ہماری مالکہ اپنے والد کے گھر پر کھائیں گی اور محل واپس آنے سے پہلے وہ کچھ دیر باغ میں چہل قدمی کریں گی.... "کنیز نے سرگوشی کی۔

اس رات کافی دیر تک خیام باغ میں شیریں کا انتظار کرتا رہا۔ آخر وہ آ گئی۔

خیام نے بے تابی کے عالم میں آگے بڑھ کر اس کی زلفوں کو چوم لیا۔ ساری کائنات پر بہار آ گئی محبت کی سرشاری میں کچھ لمحے گزار کر وہ پھر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ شیریں محل واپس جانے کے لئے اپنے والد کے گھر چلی گئی جہاں کچھ مہمان اس کا انتظار کر رہے تھے۔ خیام نشاط کرب کی کیفیت سے دوچار شعر گنگناتا ہوا اپنی تجربہ گاہ میں آ گیا۔

عمر خیام اپنے عربی گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑی علاقوں کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ ایک دوسرے گھوڑے پر اس نے اپنے کھانے پینے کا سامان اور کچھ دیگر ضروری اشیاء لاد رکھی تھیں۔ دن پہ دن گزرتا رہا اور وہ سفر کرتا رہا۔ بالآخر ایک تنگ اور دشوار گزار راستے سے ہو کر وہ الموت کی وادی میں داخل ہوا جہاں جگہ جگہ پر کٹے ہوئے انسانی سر لٹکے ہوئے تھے۔ یہ ان سیاحوں کے سر تھے جو اس سے پہلے الموت آئے تھے۔ خیام آگے بڑھتا ہوا ایک سرنگ میں داخل ہوا جس کے دوسرے سرے پر کچھ لوگ پہرہ دے رہے تھے خیام کی توقع کے خلاف ان لوگوں نے ہاتھ لہرا کر اسے خوش آمدید کہا اور قلعے کے آہنی دروازے کھول دیئے۔ آہنی دروازے کے اندر جا کر اس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ سروں پر سرخ طرے سجائے ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ وہ اپنے طور طریقے سے مہذب دکھائی دیتے تھے۔ لیکن ان کی آنکھوں سے بے رحمی اور شقاوت کا اظہار ہوتا تھا ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور بولا۔ "عمر خیام! ہم تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں"۔

خیام کو اپنا نام سن کر حیرت ہوئی۔ "میں تو بغیر کسی اطلاع کے آیا تھا پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں میرا انتظار ہو رہا تھا اور لوگ مجھ سے واقف بھی ہیں"۔ اس نے کہا۔ "ہمیں اسی وقت معلوم ہو گیا تھا جب تم نیشاپور سے روانہ ہوئے تھے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ تم پرامن مقاصد کے لئے یہاں آ رہے ہو..... شاید نئی تقویم کی تیاری کے سلسلے میں"۔

"یہ بالکل صحیح ہے۔ جیسا کہ لوگ عام طور پر کہتے ہیں کہ لوگوں کی آنکھیں اور کان ہر جگہ ہیں"۔

وہ آدمی مسکرایا اور پھر اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔" میرا نام بزرگ ہے اور یہ میرا شریک کار جہان ہے"۔

جب وہ قلعے کے اندر داخل ہوئے تو خیام نے دیکھا کہ بالکونی پر ایک عورت کھڑی ہے جس کی بڑی بڑی آنکھیں نقاب کے باوجود دکھائی دے رہی ہیں۔

" تمہاری طرح یہ خاتون بھی ہماری ایک معزز مہمان ہیں جو پرسوں یہاں پہنچی ہیں"۔ سرخ طرے والے آدمی نے خیام کو بتایا۔ پھر اس نے خیام کو رات کے کھانے کی دعوت دی جس میں عمدہ کھانے، بہترین شراب اور نایاب قسم کے پھل موجود تھے اس نے کھانے پر ہی بتایا کہ خیام کو یہاں ہر طرح کی آزادی حاصل ہوگی اور اپنے کام سے وہ جہاں بھی چاہے جا سکتا ہے۔ خیام اس مہمان نوازی پر حیران رہ گیا۔ یوسف نے اسے بتایا تھا کہ الموت کی وادی ایک ایسا ممنوعہ علاقہ ہے جہاں موت ہر اجنبی کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ بے شمار کٹے ہوئے سر یوسف کی سچائی کی گواہی دے رہے تھے۔ پھر بھی خیام کے ساتھ ان کا سلوک بالکل مختلف تھا۔ خیام نے کبوتر خانے کے برابر میں ایک اونچی جگہ پر اپنے آلے وغیرہ لگا دیئے۔ کبوتر خانے کا نگراں جو پیغام رساں کبوتروں کی تربیت کا ماہر تھا اپنے کام میں مشغول رہا۔ اس نے خیام یا اس کے آلے میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ جب کوئی کبوتر آکر اترتا تو وہ بوڑھا آدمی تہہ کیا ہوا پیغام اس سے لے کر سفید طرے والے شخص کو دے دیتا جو محل کے اندر پیغام پہنچانے پر مامور تھا۔

" چڑیوں کے رنگ سے ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کہاں کی ہیں۔ یہ ہمدان سے آ رہی ہے۔ اگر کوئی آدمی گھوڑے پر وہاں سے آئے تو اسے بیس دن لگیں گے لیکن یہ پرندہ نصف دن میں یہاں پہنچ جاتا ہے"۔ کبوتروں کے نگراں نے بتایا۔

" میں نے اس رنگ کا کبوتر کبھی نہیں دیکھا"۔ خیام نے ایک سیاہ کبوتر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

" کبوتروں کی افزائش چٹانوں کے درمیان کی جاتی ہے اور وہاں اس سے بھی زیادہ سیاہ کبوتر موجود ہیں۔ یہ صرف رات میں پرواز کرتے ہیں اور بڑے سردار کے لئے

مخصوص ہیں "۔

"کیا تمہارا سردار یہاں قلعے میں نہیں ہے "۔

"نہیں "۔ اتنا کہہ کر کبوتروں کا نگراں اپنے فرائض انجام دینے چلا گیا۔ خیام بھی اپنے تجربات میں منہمک ہو گیا۔ پھر اچانک اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے پہلو میں کھڑا ہے۔ اس نے غور سے دیکھا۔ یہ وہی عورت تھی جسے اس نے بالکونی پر دیکھا تھا۔ خیام نے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ وہ ملکہ زاردہ تھی۔ وہ ہنسی اور پھر اپنا نقاب ہٹاتے ہوئے بولی۔ "میں تیز گھوڑوں کی سواری کر کے یہاں پہنچی ہوں۔ میرا بیٹا شہزادہ احمد، شاہ کی فوجوں کے خلاف ایک دستے کی قیادت کر رہا ہے میں نے محل ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا ہے اور اب وہاں واپسی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ بہت جلد نہ کوئی محل ہوگا نہ کوئی شاہ "۔

خیام خاموشی کے ساتھ اس کے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔

ملکہ زاردہ نے پھر کہا۔ "میں خود ملکہ بنوں گی۔ یہ فدائین مجھے تاج پہنائیں گے .... اور ہاں عمر خیام! تم نے شاہ کو جنگ کا منصوبہ تیار کر کے دیا تھا، کشتیاں اور بجرے تیار تھے اور اب شاہ کی فوجیں سمندر پار کر چکی ہیں۔ مجھے جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ قسم کی حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد میں جلاوطنی کی زندگی نہیں بسر کروں گی بلکہ سچ مچ کی ملکہ بن جاؤں گی اور تمہاری طرح فدائین کی دوست رہوں گی "۔

خیام نے اس کے الفاظ سنے مگر ان کے معنی نہیں سمجھ سکا۔ "میں؟ فدائین کا دوست؟"

"فدائین تمہاری بڑی قدر کرتے ہیں۔ آخر تمہیں انہوں نے اس ممنوعہ وادی میں آنے کی اجازت کیوں دے دی؟ تمہارا سر انہوں نے کاٹ کر کیوں نہیں لٹکا دیا؟ اس لئے کہ تم ایک عمدہ حکمت عملی تیار کرو اور فتح میں ہم سب حصہ دار ہوں "۔ وہ تیزی سے واپس چلی گئی۔

دوسرے دن ملک زاردہ کے اشارے پر جہان خیام کو قلعے کے چاروں اطراف کا جائزہ لینے کے لئے اپنے ساتھ لے گیا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ تم تمام چیزیں دیکھ لو اور ہماری طاقت کے راز سے واقف ہو جاؤ" ۔ جہان نے خیام سے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ سردار ہمارا حاکم ہے ہم اس کے کارندے ہیں اور دوسرے تمام لوگ ہمارے ہاتھوں میں کھلونے ۔یہاں ان چٹانوں میں ہم ان کھلونوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالتے ہیں ۔ انہیں وہی کچھ سوچنے پر مجبور کیا جاتا ہے جو ہم چاہتے ہیں ۔یہاں انسانوں کو پتھر کی طرح سخت اور خنجر کی طرح دھاردار بنا دیا جاتا ہے" ۔ جہان نے ایک کھڈ میں اترتے ہوئے کہا۔ "یہاں وہ رقیق مادہ ہے جس سے ہم اپنے چراغ جلاتے ہیں ۔ یہ قدرتی آتش گیر مادہ ہے جو بہت تیز روشنی دیتا ہے ۔ تم کچھ ایسے زیر زمین کمرے دیکھو گے جو اس مادے کی وجہ سے ہمیشہ روشن رہتے ہیں۔یہاں ہم نوآموزوں کو تربیت دیتے ہیں" ۔

یہ مادہ الموت کے عجائبات میں سے تھا ۔ خیام کو اس کی خصوصیات کا علم تھا ۔ وہ تمام مقامات کی سیر کرتا اور تمام چیزوں کا بغور جائزہ لیتا ہوا اس جگہ پر واپس آگیا جہاں اس کے آلات نصب تھے ۔

رات کے وقت جبکہ خیام ستاروں کے مطالعے میں محو تھا دور الموت کی پہاڑیوں سے عربی گھوڑوں پر سوار ایک مرد اور ایک عورت گزر رہے تھے جن کی حفاظت کچھ دوسرے گھڑ سوار کر رہے تھے ۔ وہ لوگ تیزی سے اپنے..... گھوڑے دوڑا رہے تھے اور رات کی رات الموت پہنچ جانا چاہتے تھے ۔ رات کی تاریکی میں ہی فدائین کے سردار اور کنیز ایفا کا الموت پہنچ جانا ضروری تھا ۔

دوسرے دن جہان نے آکر خیام سے کہا۔ "گزشتہ رات ہمارا سردار یہاں واپس آگیا ہے ۔ بہت جلد تمہیں ہم لوگوں کے منصوبے کی نوعیت کا علم ہو جائے گا اور تمہاری بنائی ہوئی نئی تقویم ایک نئے زمانے کی ابتداء ثابت ہو گی" ۔ وہ جھکا پھر بولا۔ "سردار نے تمہیں یاد کیا ہے" ۔

خیام اس کے ساتھ چل پڑا ۔ اونچی چوٹی پر وہ لوگ ایک ایسے دروازے پر پہنچے

جس پر عمدہ قسم کے نقش ونگار کے ساتھ سونے کی کیلیں لگی ہوئی تھیں۔ جہان نے یہ دروازہ کھولا اور سردار کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرہ ہر طرح مزین تھا۔ ایک طرف دیوار کے قریب فدائین کا سردار بیٹھا ہوا تھا۔ ملکہ زاروہ اور کچھ دوسرے لوگ اس کے پاس ہی کھڑے تھے۔ سردار پر نگاہ پڑتے ہی خیام کا جیسے سر گھوم گیا، اس نے اپنی آنکھیں جھپکائیں اور سردار کے چہرے کو ایک بار پھر بغور دیکھا۔ وہ.... وہ اس کا دوست حسن تھا۔

"عمر خیام! ہم الموت میں تمہارا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہم اپنی قابل فخر برادری میں تمہارا خیر مقدم کرتے ہیں"۔ حسن نے کہا دو کاتب اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ لکھتے گئے۔ حسن نے کچھ اشارہ کیا۔ بزرگ ایک طشت میں رکھے ہوئے سفید طرے کو لئے آگے بڑھا جس میں سات طلائی ستارے ٹنکے ہوئے تھے۔

"ہم تمہیں لائق تعظیم سمجھتے ہیں اسی لئے یہاں کے تمام لوگوں سے بلند رتبہ عطا کر رہے ہیں۔ تم میری طرح سفید طرہ استعمال کرو گے اور میرے قریب جگہ پاؤ گے...." حسن نے کہا۔ خیام نے طشت پر سے طرہ اٹھا لیا اور اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے دیکھنے لگا جیسے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر رہا ہو۔ حسن اس توقع پر خاموش تھا کہ خیام یہ اعزاز قبول کرتے ہوئے طرہ اپنے سر پر رکھ لے گا لیکن چند لمحوں بعد خیام نے وہ طرہ طشت پر واپس رکھ دیا اور حسن کی طرف دیکھتا ہوا بے خوفی سے بولا۔ "میں نے شاہ سے وفاداری کا عہد کیا ہے اور جب تک وہ باقی ہیں ان سے دھوکا یا غداری کرنے والا ہر شخص میرا دشمن ہے میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک ان کے تخت و تاج کی حفاظت کروں گا"۔

ooo

تمام لوگ سردار کی طرف دیکھنے لگے۔ حسن نے بڑے تحمل اور اعتماد کے ساتھ کہا۔ "میں ایک خوشخبری سناتا ہوں۔ تمہاری تیار کردہ حکمت عملی کے باعث شاہ اور ان کی فوجیں سمندر عبور کر گئیں اور انہوں نے بازنطینیوں کو شکست دے دی لیکن

اس کے لئے انہیں بڑی قربانی دینی پڑی ۔ شاہ کی نصف فوج اس گھمسان کی جنگ میں ہلاک ہو گئی ۔ اور خود شاہ اور ان کا چھوٹا بیٹا شہزادہ مالک بھی زخمی ہو گئے ہیں"۔

خیام اس خبر کو سن کر پریشان ہو گیا حسن نے خیام کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے کہا۔ "شاہ خود اپنی فتح کے ہاتھوں کمزور ہو گئے ہیں ۔ ہم اسی وقت کا انتظار کر رہے تھے ۔ ملکہ زاردہ اور شہزادہ احمد ہمارے ساتھ ہیں، شہزادہ احمد ایک گھڑ سوار دستے کی قیادت کر رہے ہیں جو شاہ کی رہی سہی فوجی قوت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گا ۔ شاہ اور شہزادہ مالک بھی مارے جائیں گے اور اگر وہ جنگ میں کسی طرح بچ بھی گئے تو ہمارے خنجر.... ہر صورت میں.... "اس نے نیچے زمین میں دفن کر دینے کا اشارہ کیا۔ "پھر شہزادہ احمد اپنے باپ کی جگہ لیں گے ہم ان کی نگرانی کریں گے ۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ حقیقت میں حکمرانی میں کروں گا ۔ ہم اپنے تمام پڑوسی ممالک کے خلاف ایک مقدس جنگ شروع کر دیں گے.... کچھ ہی دنوں میں سات سمندر پار تک ہماری اپنی حکومت ہو گی...."

زاردہ نے خیام کی طرف دیکھا اور مسکرائی ۔ حسن اپنے تخت سے نیچے اتر آیا ۔ "ہماری گھڑ سوار فوج پہلے مصر پر حملہ کرے گی پھر کشمیر پر اس کے بعد...."

خیام حسن کی باتیں سن کر گھبرا گیا ۔ اس نے حسن سے سوال کیا۔ "کیا ہمارا عزیز دوست نظام بھی ان معاملات میں تمہارے ساتھ ہے ؟"

"نظام...." حسن کی آواز غصے سے لرزنے لگی ۔ اسی وقت اس نے دیکھا کہ کبوتر خانے کا بوڑھا نگراں ایک کبوتر ہاتھ میں لئے آرہا ہے ۔ بوڑھے نگراں نے کبوتر ایک اور شخص کے ہاتھ میں تھما دیا ۔ اس شخص نے پرندے سے بندھا ہوا کاغذ جس پر کوئی پیغام درج تھا حسن کی طرف بڑھایا ۔ حسن نے اسے خیام کی طرف بڑھانے کا اشارہ کیا ۔ خیام نے ابھی کاغذ کھول کر پیغام پڑھنا بھی شروع نہیں کیا تھا کہ حسن نے کہا "خود ہی پڑھ لو نظام مر چکا ہے"۔

خیام، حسن کی بے رحمی پر حیرت زدہ رہ گیا۔

" تم تو اس کے زندگی بھر کے دوست تھے " خیام نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ " تم نے اسے تحفے دیئے اور اس کا اعتماد حاصل کیا۔ اور اسی اعتماد کے ہاتھوں وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا " ۔

" وہ شاہ سے بہت قریب اور ان کا وفادار تھا " ۔ حسن نے کہا۔ " حالات بدل جاتے ہیں ۔ پرانی حکومتیں ختم ہو جاتی ہیں اور نئی حکومتیں قائم ہوتی ہیں ۔ ہمیں ذرا طاقتور ہو لینے دو۔ تم میرے قونصلر ہو گے ۔ تمہارے علم اور تعاون سے ہم کامیابی و کامرانی کے راستے پر آگے بڑھتے جائیں گے ۔ خدا نے پوری دنیا کو ہمارے قدموں پر ڈال دیا ہے " ۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور اب ہال میں تاریکی پھیل رہی تھی ۔ بہت سے لوگ چراغ جلانے میں لگ گئے ۔ بزرگ نے سفید طرے والا طشت پھر اٹھایا۔ خیام نے یہ دیکھ کر کہا " ایک نئی حکومت کا قونصلر ہونا واقعی ایک اعزاز ہے لیکن میں اس سے بہت کم پر ہی مطمئن ہوں " ۔ اس نے جیب سے کاغذ کے کچھ پرزے نکالے جن پر ہیئت اور ریاضی کے نئے فارمولے لکھے ہوئے تھے ۔ " یہ آنے والے زمانے میں ایک طویل مدت تک انسانوں کی رہنمائی کرتے رہیں گے ۔ ان سے وقت کے نظام میں ایک ترتیب پیدا ہو جائے گی ۔ اب تم ہی بتاؤ کہ تمام انسانوں کے مفاد کے لئے کام کرنا بہتر ہے یا ہزاروں خنجروں کے ذریعہ حاصل کی گئی حکومت کے فریب میں رہنا ؟ " پورے ہال میں سرگوشیاں ہونے لگیں ۔ لیکن خیام جرأت کے ساتھ بولتا رہا۔ " اس زمین پر صدیوں سے ظلم ہو رہا ہے ۔ لیکن ظلم کے ذریعہ قائم کی گئی حکومت کی زندگی مختصر ہوتی ہے ۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے نئی تقویم کی تیاری کے سلسلے میں جو کام کئے ہیں وہ بہت عظیم ہیں لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں یہاں سے نہیں جا سکتا کیونکہ صرف قاتل فدائین کو ہی ان پہاڑوں سے زندہ واپس جانے کی اجازت ملتی ہے " ۔

حسن نے کہا ۔ " میں تمہیں شان و شوکت اور شہرت عطا کرتا ۔ تمہارے شعر کے ایک ایک لفظ کے بدلے تمہیں انمول ہیرے اور جواہرات دیتا ۔ مگر تم ..... خیر تم

جا سکتے ہو۔ میرے حکم سے تمہاری جان بخش دی جائے گی۔ ہمارے خنجر تمہارے خون کا خراج نہیں وصول کریں گے۔ جاؤ تم آزاد ہو"۔

"تم نے مجھے میری زندگی تحفے کے طور پر بخش دی ہے اور زندگی کا تحفہ دوسرے تمام تحفوں سے بڑا ہوتا ہے لہٰذا اپنا پہلا تحفہ واپس لے لو۔ اسی کے ساتھ ہماری دوستی بھی ختم سمجھو۔" خیام نے حسن کی دی ہوئی سونے کی زنجیر اس کے قدموں پر پھینک دی حسن نے کچھ نہیں کہا۔ وہ ساکت اپنی جگہ پر کھڑا رہا مگر بزرگ نے آگے بڑھ کر صدا لگائی "او خدا! کیا اس کے لئے کوئی سزا نہیں ہے...."

خیام واپس ہونے لگا تو اس نے سنا حسن کہہ رہا تھا "بہتر یہی ہے کہ اسے جانے دیا جائے وہ خود اپنی وفاداری کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ شہزادہ احمد اور اس کی فوجیں ان لوگوں کو نیست و نابود کر دیں گی"۔ حسن کے حکم پر خیام اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر الموت سے رخصت ہو گیا۔

OOO

خیام جلد از جلد شاہ تک پہنچنے کے لئے دن رات چلتا رہا۔ جب وہ مسلسل سفر کے بعد شاہ کے کیمپ میں پہنچا تو تھکن سے چور ہو چکا تھا۔ اسے آرام کے لئے فوراً شہزادہ مالک کے خیمے میں لے جایا گیا لیکن اس نے آرام کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ شہزادہ مالک کی زبانی جنگ کی پوری روداد سننا چاہتا تھا۔

"میرے زخم بہت زیادہ گہرے نہیں ہیں"۔ شہزادے نے کہا۔ "لیکن شاہ کا بہت سارا خون ضائع ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں احمد کی بغاوت اور نظام کے قتل کا بھی صدمہ ہے۔ حالات کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ ان پر قابو پانا مشکل ہو رہا ہے"۔

"مجھے فوراً شاہ کے پاس لے چلو"۔ خیام نے کہا۔ "میں براہ راست فدائین کے صدر مقام الموت سے آ رہا ہوں۔ مجھے ان کے منصوبے کا علم ہے"۔

شہزادہ مالک خیام کو شاہ کے خیمے میں لے گیا۔ شاہ بہت لاغر اور مضمحل حالت میں ایک صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ پہریدار اس کے آس پاس کھڑے تھے اور معالج اس کے

زخموں کی پٹیاں بدل رہا تھا۔ خیام کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر شاہ نے اپنے بازو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "عمر! میرے بیٹے عمر!"

خیام نے تمام تکلفات اور رسمی باتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔ "حضور عالی! میں براہ راست الموت کی پہاڑیوں سے آرہا ہوں جو فدائین کا گھر ہے فدائین ہی آپ کے اصل دشمن ہیں۔ میں ان کے منصوبے سے واقف ہوں"۔

"میرا بیٹا احمد اور اس کی فوجیں ہمارے لئے زیادہ بڑا خطرہ ہیں۔ نظام کے قتل، احمد کی بغاوت اور ملکہ زاردہ اور حسن کے فدائین کی سازش نے ہمیں سخت مشکل میں ڈال دیا ہے ہم نے باز نطینیوں پر جو فتح حاصل کی تھی وہ بغاوت اور اندرونی سازش کے سبب شکست میں بدلتی نظر آرہی ہے"۔ شاہ نے کہا۔

اتنے میں ایک پیغام رساں خیمے میں داخل ہوا۔ اس نے شاہ کے سامنے جھکتے ہوئے کہا۔ "ظل الہیٰ! میں یہ اطلاع دینے حاضر ہوا ہوں کہ شہزادہ احمد کی فوجیں بہت قریب آگئی ہیں ان کے ساتھ ایک ہزار گھڑ سوار ہیں جو نیشاپور کی طرف بڑھ رہے ہیں"۔

شاہ پر اس خبر سے وحشت طاری ہو گئی اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر بیٹھ نہیں سکا۔ صوفے پر دوبارہ لیٹتے ہوئے اس نے کہا۔ "ہمیں فوراً نہیں جا لینا چاہئے ورنہ وہ ہر اس شخص کو قتل کر ڈالے گا جو اس کی جانشینی کو چیلنج کرے گا۔ وہ شاہی خاندان کے تمام بچوں کو مار ڈالے گا وہ ہمیں اور اپنے بھائی کو بھی نہیں بخشے گا"۔

"آپ کے زخموں سے خون رسنے لگا۔" معالج نے تنبیہہ کی۔

"مجھے اپنے کچھ محافظ لے جانے دیجئے۔ میں احمد کا پیچھا کروں گا اور اس کی فوجوں کے خلاف محل کی حفاظت کروں گا"۔ شہزادہ مالک نے شاہ سے کہا۔

"تمہارے پاس اتنے آدمی نہیں ہوں گے کہ تم محل پر کئے جانے والے حملے کو روک سکو"۔ خیام نے مداخلت کی۔ "بہتر یہ ہو گا کہ حرم کی خواتین اور بچوں کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دیا جائے"۔ پھر وہ شاہ سے مخاطب ہوا۔ "شہزادہ مالک کو حکم

دیکھیئے کہ وہ خواتین اور بچوں کے ساتھ پوری تیز رفتاری سے الموت کی طرف روانہ ہو جائیں۔ اپنی فوجوں کو بھی اسی سمت میں روانہ کر دیجیئے۔ ایک حملے میں تمام دشمنوں کا صفایا ہو جائے گا"۔

اس کے بعد اس نے ایک ایسی حکمت عملی پیش کی جس کے لئے بہت جرأت اور ہمت کی ضرورت تھی۔

"عمر خیام کی حکمت عملی نے ہمیں باز نطینیوں پر فتح بخش دی اور اب..... "شاہ نے خیام سے اپنا منصوبہ دہرانے کو کہا۔

خیام نے تمام سپہ سالار کی موجودگی میں کہا۔ "میں ابھی الموت کے قلعے سے واپس آرہا ہوں جو شاہ کے دشمنوں کا گڑھ ہے حسن فدائین کا بڑا سردار ہے۔ ملکہ زاردہ اور شہزادہ احمد اس سے تعاون کر رہے ہیں۔ قلعہ الموت کی چٹانوں پر واقع ہے جس میں قدرتی آتش گیر مادے کے ذریعہ چراغ جلائے جاتے ہیں۔ قلعے کی ایک جانب کی چٹان ایسی ہے جس میں آسانی کے ساتھ سرنگ بنا کر آتش گیر مادے کے ذخیرے تک پہنچا جا سکتا ہے"۔

"تو تمہارا منصوبہ یہ ہے کہ اس ذخیرے میں آگ لگا کر سب کچھ بھسم کر دیا جائے"۔ ایک سپہ سالار نے کہا۔

"ہاں!" خیام نے کہا۔ "چٹانوں میں چونا موجود ہے۔ اس میں آگ لگ جانے پر اسے پانی سے بھی نہیں بجھایا جا سکتا۔ فدائین یقیناً اس پر پانی پھینکیں گے جس سے ایک زبردست دھماکہ پیدا ہوگا۔ اور حرم کی خواتین اور بچوں کے وہاں پہنچنے پر شاہ کی فوجیں اپنے کیمپوں میں ان کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ باز نطینیوں کے کٹے پھٹے خیمے مرمت کر کے قابل استعمال بنا دیئے گئے ہیں۔ ان میں انہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی"۔

خیام کے منصوبے کے مطابق پیش قدمی شروع ہو گئی اپنے زخموں اور کمزوری کے سبب شاہ اس میں کچھ زیادہ عملی تعاون نہ کر سکا۔ شہزادہ مالک کے خیمے میں داخل

ہوتے ہی اس نے پوچھا۔ "تمام لوگ بخیر ہیں"؟

"ملکہ شیریں، حرم کی خواتین اور بچے تمام لوگ بالکل بخیر ہیں"۔ مالک نے جواب دیا۔

"اور ایفا"؟ خیام نے سوال کیا۔

"ایفا، حسن کے ساتھ چلی گئی ہے۔ وہ قلعے میں ہو گی"۔

خیام پریشان سا ہو گیا۔ اس نے حسن اور ملکہ زاردہ کو قلعے میں دیکھا تھا مگر.... اسے مکمل یقین تھا کہ ایفا اس کی وفادار ہے اور وہ حسن سے نفرت کرتی ہے۔ وہ ضرور اس سے دوبارہ ملنے کی غرض سے ہی حسن کے ساتھ گئی ہو گی اور اب ان کی قید میں ہو گی اس نے سوچا۔

الموت کی وادی میں پہنچنے کے بعد شاہ کے سپہ سالار بددل ہونے لگے۔ انہوں نے خیام کے خلاف شاہ سے شکایت کی "اس تنگ وادی سے ہم قلعے پر کیسے حملہ کر سکتے ہیں؟ ہم اس بھاری چٹان کے نیچے سرنگ کیسے کھود سکتے ہیں؟ احمد اور اس کی فوجیں فوراً ہمیں آلیں گی۔ ہمارے بہت سے لوگ مارے جا چکے ہیں اور بہت سے زخمی ہیں"۔

"یہاں پہنچنے سے پہلے یہ منصوبہ بہت خوب معلوم ہو رہا تھا مگر اب...."

پہاڑوں اور چٹانوں پر حملہ کرنا بالکل بے کار ہے۔ فدائین ساری دنیا کی طاقت کے خلاف بھی اس کی حفاظت کریں گے"۔

"وہ اونچی چٹانوں سے ہماری تمام نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔ کھلے میدان میں ہم کچھ کر سکتے تھے لیکن یہاں...."

"یہ خیام کا منصوبہ تھا مگر ستاروں کی پیمائش اور بات ہے اور چٹانوں کی پیمائش اور بات...."

"میں نے تمام چیزوں کا نہایت احتیاط اور ذمے داری کے ساتھ جائزہ لیا ہے کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اسی پر زندگی اور موت کا انحصار ہے"۔ خیام نے کہا۔

"لیکن اگر یہ منصوبہ ناکام ہو گیا تو"؟

"اگر یہ منصوبہ ناکام ہو گیا تو ہم وادی میں لڑیں گے۔ ہم ہر اس جگہ جنگ کریں گے جہاں ہم موجود ہیں مگر ہتھیار کسی قیمت پر نہیں ڈالیں گے خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ہم آخری دم تک جنگ جاری رکھیں گے"۔ شاہ نے کہا۔ اس کا چہرہ نقاہت سے زرد ہو گیا۔ تکئے کا سہارا لے کر وہ پھر لیٹ گیا۔ شہزادہ مالک اور خیام نے اسے لیٹنے میں مدد دی۔ مگر اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ فوراً حرم کی خواتین کو بلایا گیا۔ شاہ نے ان کی طرف دیکھ کر خدا حافظ کہا۔ پھر خیام، شہزادہ مالک اور ملکہ شیریں کی مدد سے سیدھا لیٹ گیا۔

"میں اپنے ملک کی اس جنگ میں حصہ لینے کے لئے زندہ نہیں رہوں گا لیکن میرا بیٹا شہزادہ مالک اس ذمے داری کو پورا کرے گا تم تمام لوگ اس کے اسی طرح وفادار رہنا جس طرح تم میرے وفادار تھے۔ تم لوگ اس سے وفاداری کا وعدہ کرو"۔ شاہ نے کمزور مگر واضح آواز میں کہا۔

"ہم عہد کرتے ہیں کہ آپ کے جانشین شہزادہ مالک کے وفادار رہیں گے"۔ وہاں پر موجود تمام لوگوں نے کہا۔ شاہ کے چہرے پر خوشی اور بشاشت کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس نے شہزادہ مالک سے کہا۔ "میرے بیٹے! اپنے اور اپنی حکومت کے وقار کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ سچائی اور وفاداری کو دوسری تمام چیزوں پر مقدم جاننا اور ان کی قدر کرنا .... عمر خیام نے اپنی وفاداری ثابت کر دی ہے۔ اس کے منصوبے کی وجہ سے یقیناً تمہیں فتح نصیب ہو گی اور ہمارا ملک محفوظ رہے گا"۔ ان الفاظ کے ساتھ شاہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کی روح جسم سے جدا ہو گئی۔

دوسرے دن شاہ کو پورے اعزاز کے ساتھ سپرد خاک کرنے بعد شہزادہ مالک، عمر خیام کے خیمے میں داخل ہوا۔

"ہم لوگ اب حملہ شروع کرنے والے ہیں۔ ہم نے پیش قدمی کا حکم دے دیا

ہے" ۔ شہزادہ مالک نے خیام سے کہا۔" باز نطینی قیدی آپ کے احکامات کا انتظار کر رہے ہیں لیکن قبل اس کے کہ آپ یہاں سے رخصت ہوں..... میرے والد کی وصیت یہ ہے کہ میں ہمیشہ سچائی اور وفاداری کو نوازوں ۔ مرتے وقت ان کے ہونٹوں پر آپ کا نام تھا۔ میرے والد نے شیریں سے شادی کی تھی ۔ میں نے ان کی پسند اور خواہش کا احترام کیا۔ رسم کے مطابق ملکہ شیریں کو اپنی بقیہ زندگی اپنے مرحوم شوہر کی یاد میں گزار دینا چاہیئے لیکن کل جنگ ختم ہونے کے بعد، جب ہم فتح حاصل کر لیں اس کے بعد میں ملکہ شیریں کو روایت کے بندھن سے آزاد کر دوں گا کیونکہ میرا خیال یہ ہے کہ دل کی آواز ضرور سنی جانی چاہیئے"۔

خیام خاموشی کے ساتھ شہزادے کی باتیں سنتا رہا۔ شہزادہ مالک اپنی بات ختم کر کے مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔

" باز نطینی قیدی قطاروں میں کھڑے ہوئے تھے ۔ خیام نے ان کے قریب جا کر احکامات دیئے اور الموت پر حملہ شروع ہو گیا۔ فضا دھوئیں اور بارود سے بھر گئی۔

ooo

کبوتر خانے کے برابر والی چھت سے فدائین کا سردار حسن اور دوسرے لوگ نیچے وادی میں شاہ کی فوجوں کو آتا ہوا دیکھ رہے تھے ۔" کیا انہیں واقعی یقین ہے کہ وہ پہاڑوں پر حملہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے "؟۔ حسن نے پوچھا۔ پھر ہنستا ہوا بولا۔ " ہم صرف شہزادہ احمد کی فوجوں کے پہنچنے کا انتظار کر رہے ہیں اس کے بعد لوگ دیکھیں گے کہ ہماری فوجوں اور چٹانوں کے درمیان وہ کس بری طرح کچلے جاتے ہیں"۔

" ان کا خاتمہ قریب ہے "۔ بزرگ نے کہا۔

ایفا، خیام کی دی ہوئی طلائی زنجیر گلے میں پہنے ہوئے چھت پر آئی تو حسن نے کہا۔" اس جگہ سے تم بہت اچھی طرح دشمن کا نظارہ کر سکتی ہو"۔

" میں صرف ایک شخص کو دیکھنا چاہتی ہوں ۔ اس ایک شخص کو جس کے بارے میں آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں آپ کے ساتھ آئی تو وہ مجھے مل جائے گا"۔ ایفا

نے کہا۔

حسن مسکرایا پھر تلخی کے ساتھ بولا۔"ہاں! میں نے وعدہ کیا تھا چونکہ وہ یہاں تھا مگر اب وہ یہاں سے جا چکا ہے میں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن....."

"آپ نے مجھے تالے میں بند کیوں رکھا۔؟ مجھے اس سے ملنے کیوں نہیں دیا؟"۔ ایفا نے کہا۔

"ملکہ زاردہ کا حکم یہی تھا۔ وہ ملکہ ہیں اور تم محض ایک کنیز"۔

"خزار عورتیں جن سے ملکہ زاردہ کا تعلق ہے دھوکے باز اور پست ذہنیت کی ہوتی ہیں۔ ان کے دل چھل اور فریب سے بھرے ہوتے ہیں"۔

اسی اثناء میں ملکہ زاردہ بھی چھت پر آ گئیں۔ انہوں نے حسن اور ایفا کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی اسی لئے ان کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ "خزار عورتوں کے دل چھل اور فریب سے بھرے ہوتے ہیں"۔ انہوں نے چیختے ہوئے کہا۔ "بربر کنیز! تجھے ہماری نسل کے لوگوں کے بارے میں بولنے کی جرأت کیسے ہوئی؟۔ بربر عورتیں ہمیشہ غلام رہی ہیں۔ میں حکمراں ملکہ بننے کے بعد ان پر اور زیادہ سختی کروں گی تاکہ وہ کبھی غلامی کا جوا نہ اتار سکیں"۔

ایفا نے حسن کی طرف التجا آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔"مجھے آزاد کر دیجئے میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں مجھے یہاں سے بھاگنے دیجئے۔ میں کوئی گراں قدر یرغمال نہیں بلکہ ایک معمولی کنیز ہوں۔ ایسی عورت کس کام کی جس کا دل کہیں اور ہو۔ وہ آپ کو کوئی خوشی نہیں دے سکتی۔ خدا کے لئے مجھے جانے دیجئے"۔

جاؤ"۔

"اپنے آدمیوں کو حکم دیجئے کہ وہ پھاٹک کھول دیں تاکہ میں قلعے سے رخصت ہو سکوں۔ میں وادی میں اپنا راستہ خود تلاش کر لوں گی۔ میرا دل میری رہنمائی کرے گا"۔

"دشمنوں کے کیمپ تک؟"

"اس تک جو میرا انتظار کر رہا ہے"۔

"وہ تمہارا یا کسی کنیز عورت کا انتظار نہیں کر رہا ہے اب ملکہ شیریں وہاں موجود ہے"۔ ملکہ زاردہ نے کیمپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ ادھر شاہ فوجی امور میں مصروف ہوں گے اور ادھر نوجوان ملکہ اور عمر....."

"یہ صحیح نہیں ہے"۔ ایفا نے ان کی بات کاٹتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ پھر ذرا رک کر دھیمے لہجے میں بولی۔ "یہ ممکن نہیں ہے کہ شاہ کا انتقال ہو چکا ہے"۔

"شاہ کا انتقال ہو چکا ہے؟"۔ حسن نے حیرت سے کہا۔ "تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے آج صبح سویرے دیکھا تھا کہ پرچم سرنگوں ہے"۔

"اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ ایک اچھی خبر ہے"۔ ملکہ زاردہ نے مسرت کے ساتھ کہا "ہم نصف فتح حاصل کر چکے ہیں۔ ہمیں یہ خبر فوراً شہزادہ احمد تک بھجوا دینی چاہئے۔ پیغام رساں کبوتروں کو جہاں تک جلد ممکن ہو یہاں سے روانہ کر دیا جائے تا کہ شہزادہ احمد یہ فیصلہ کر سکیں کہ انہیں کب اور کہاں حملہ کرنا ہے"۔

حسن نے حکم دیا کہ شہزادہ احمد کو فوراً پیغام بھجوایا جائے۔ ایفا آنکھوں میں آنسو لئے حسن کے آگے جھکی ہوئی تھی حسن نے ایفا کو دیکھا۔ وہ شاید اسے جانے کی اجازت دے دیتا مگر ملکہ زاردہ کی موجودگی میں اس کے لئے یہ ممکن نہ ہو سکا۔

"یہ بربر لڑکی سب کچھ دیکھتی اور سب کچھ جانتی ہے یہ ہم لوگوں کو دشمنوں کی خبریں دیتی ہے اور دشمنوں کو ہماری خبر دے گی۔ اسے یہیں ہم لوگوں کے ساتھ رہنا چاہئے" ملکہ زاردہ نے کہا۔

حسن چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ملکہ زاردہ اور دوسرے لوگ بھی چلے گئے۔ ایفا اکیلی رہ گئی۔ اچانک اس نے ایک عجیب آواز سنی۔ اس نے کبوتر خانے کی طرف دیکھا کبوتر دانے پر گر رہے تھے مگر یہ آواز ان کی نہیں تھی۔ چھت کے کنارے پر جا کر ایفا نے نیچے وادی میں دیکھا۔ لوگوں کی ایک جماعت چٹانیں توڑنے میں مصروف تھی۔ ایک

طرف ایک گھوڑا کھڑا تھا جس پر اس کا مالک اس کا آقا عمر خیام بیٹھا تھا۔ وہ عجیب آواز جو ایفا نے سنی تھی قلعے کے دوسرے لوگوں نے بھی سنی۔ چند ہی لمحوں میں حسن اور بزرگ چھت پر پھر واپس آئے اور ایفا سے ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر نیچے وادی میں دیکھنے لگے۔

"کچھ لوگ چٹانیں توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں"۔ بزرگ نے کہا۔

"کچھ اور لوگ لوہے کی سلاخیں لئے کھڑے ہیں"۔ حسن نے کہا۔

"لیکن وہ کر کیا رہے ہیں اور ان کا مقصد کیا ہے؟"۔ بزرگ نے سوال کیا۔

حسن ہنسا۔ "وہ پاگل ہیں"۔ لیکن پھر فوراً ہی وہ سنجیدہ ہو گیا"۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ ہمارے پھاٹکوں تک نہیں آسکتے۔ انہیں معلوم ہے کہ یہ قلعہ صدیوں سے قائم ہے اور وہ صرف چٹانوں میں سرنگ کھود کر ہی اپنا راستہ بنا سکتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ نیچے کی طرف سے حملہ کر سکتے ہیں اور...."

"ان کے درمیان عمر خیام بھی نظر آرہا ہے۔ وہ آلے کے ذریعہ پیمائش میں مصروف ہے"۔ بزرگ بولا۔

حسن خاموشی کے ساتھ خیام کو دیکھتا رہا۔ پھر تلخی کے ساتھ بولا۔ "یہ اسی کا منصوبہ ہے۔ یہ حکمت عملی اسی کی تیار کی ہوئی ہے، وہ چٹانوں کی قسموں اور ان کی خاصیتوں سے واقف ہے اس نے ہمارے زیر زمین کمرے دیکھے ہیں۔ انہیں فوراً روک دیا جانا چاہیئے۔ اگر وہ قلعے میں داخل ہو گئے تو ہم زیر زمین قلعے سے حملہ کر کے انہیں اس وقت تک روکے رکھیں گے جب تک کہ شہزادہ احمد وادی میں پہنچ کر ان کی تمام فوج کا محاصرہ نہ کر لیں"۔ پیچھے گھومتے ہوئے اس نے کبوتر خانے کے نگراں کو آواز دی اور شہزادہ احمد کے نام ایک پیغام لکھ کر اس کے حوالے کیا۔ پیغام میں شہزادہ احمد کو تمام حالات سے مطلع کرتے ہوئے جلد سے جلد حملے کے لئے کہا گیا تھا۔

کبوتر خانے کے نگراں نے پیغام کو تہہ کر کے ایک کبوتر سے باندھا اور اسے فضا میں چھوڑ دیا۔ ایفا چپ چاپ کبوتر کو پرواز کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ ساری

باتیں سمجھ گئی تھی جب حسن بزرگ اور کبوتر خانے کا نگراں وہاں سے رخصت ہو گئے تو وہ اوپر چڑھ کر کبوتر خانے کے پاس گئی اور ایک طرف سے تمام کبوتروں کے پنجرے کھول کر انہیں آزاد کر دیا۔ کبوتر آزاد ہو کر کھلی فضا میں اڑنے لگے۔ اب انہیں پیغام رسانی کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔

سینکڑوں کبوتروں کی پھڑپھڑاہٹ کی آواز سن کر حسن، ملکہ زادہ، بزرگ اور کچھ دوسرے لوگ فوراً چھت پر پہنچ گئے ایفا کی آنکھیں انہیں دیکھ کر غصے سے جلنے لگیں۔ اس کی جان خطرے میں تھی اس کے باوجود وہ خوفزدہ نہیں تھی۔ ان لوگوں نے آکر اسے گھیر لیا۔ پھر اٹھا کر اسے چھت کے کنارے لائے اور نیچے دھکیل دیا۔ نیچے وادی کے لوگوں نے چیخوں کی آواز سن کر اوپر دیکھا۔ ایک انسانی جسم چٹانوں پر سے لڑھکتا ہوا نیچے آرہا تھا اوپر، بہت اوپر نیلا آسمان رنگ برنگے کبوتروں سے بھرا ہوا تھا۔ خیام نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھایا۔ شہزادہ مالک اور شاہی نقیب نے بھی آگے بڑھنے میں اس کا ساتھ دیا۔ ایفا کے مسخ شدہ جسم کے قریب پہنچ کر وہ گھوڑے سے اتر گیا۔ اس نے غور سے دیکھا وہ مر چکی تھی۔

خیام نے ایفا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنی سونے کی زنجیر ایفا کے گلے میں دیکھ کر افسردگی کے ساتھ مسکرایا۔ "پیاری ایفا! تمہاری آرزو بہر حال پوری ہو گئی"۔ اس نے آہستہ سے کہا اور پھر ایفا کے گلے سے زنجیر نکال کر اپنے بازو پر باندھ لی۔ اس نے اپنے دل میں عہد کیا کہ وہ اس زنجیر کو ایفا کے خلوص و وفا کی علامت کے طور پر ہمیشہ اپنے ساتھ رکھے گا۔ شہزادہ مالک کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "میرے شہزادے! آج آسمان پر ایک نیا ستارہ روشن ہو گا.... آؤ ہم ایفا کی لاش کو دفن کر دیں۔ کل ایک چٹان لا کر اس کی قبر کے پاس رکھ دیں گے تاکہ نشان رہے۔ المَوت اس کی یادگار ہے اس کی قبر پر رکھی جانے والی چٹان ہماری فتح کی علامت ہو گی"۔

جیسے ہی چٹانیں ٹوٹیں اور ان کے نیچے راستہ بننا شروع ہوا باز نطینی قیدی مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے۔ کچھ آہنی سلاخوں سے کام کرنے لگے اور کچھ کدالوں سے۔

کچھ سرنگ کے اندر جا کر لکڑیاں بچھانے لگے ۔ وہ سب پسینے میں شرابور بڑی محنت سے کام کر رہے تھے ۔ ان کے لیے وقت کی بڑی اہمیت تھی انہیں معلوم تھا کہ سرنگ کی تعمیر کا کام شہزادہ احمد کے وادی میں داخل ہونے سے پہلے مکمل ہو جانا چاہیئے ۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس کی انہیں سخت سزا بھگتنی ہو گی ۔ خیام تمام کاموں کا جائزہ لے رہا تھا ۔ اگر کہیں کوئی نقص نظر آتا تو وہ فوراً اس کی نشاندہی کرتا ۔ مزدور اسے درست کرنے میں لگ جاتے ۔ مزدوروں کی کوئی ٹولی اگر تھک جاتی تو فوراً اس کی جگہ دوسری تازہ دم ٹولی لے لیتی ایک بار ایک غار کے دہانے سے اپنا ہاتھ نکالتے ہوئے خیام نے شہزادہ مالک اور سپہ سالاروں سے کہا ۔ "ہم نے تیل کا ذخیرہ پالیا ہے " ۔

لیکن اس خوشخبری کے ساتھ ہی ایک بری خبر بھی پہنچی ۔ اور وہ یہ کہ شہزادہ احمد کی فوجیں قریب آ گئی ہیں ۔

"وہ کتنا قریب آ گئے ہیں " ؟ ۔ شہزادہ مالک نے پوچھا ۔

"رات تک وہ وادی میں پہنچ جائیں گے " ۔ پیغامبر نے کہا ۔

"ہمیں فوراً ان پر گھڑ سواروں کے ذریعہ حملہ کر دینا چاہئے " ۔ ایک سپہ سالار نے کہا ۔

"ہماری تعداد ان کے مقابلے میں بہت تھوڑی ہے " ۔ دوسرے سپہ سالار نے کہا ۔

"ہم اس تنگ وادی میں کس طرح لڑ سکتے ہیں اور پھر عورتوں اور بچوں کا کیا ہو گا " ؟ ۔ تیسرے سپہ سالار نے مایوسی کے ساتھ سوال کیا ۔

خیام پر ان مایوس کن باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا ۔ اس نے شہزادہ مالک سے مخاطب ہو کر کہا ۔ " اگر احمد کی فوجیں آج رات یہاں پہنچ جاتی ہیں تب بھی سب سے پہلے انہیں کیمپ بنانے پڑیں گے ۔ ایسی صورت میں صبح کے وقت جبکہ سورج کی پہلی کرن قلعہ پر پڑے تیزی اور پوری قوت کے ساتھ ان کے کیمپ پر حملہ کر دیا جائے ۔ یاد رکھو کہ اچانک حملہ فتح کی کلید ہے ۔ اس وقت تک سرنگ کا کام بھی بالکل مکمل ہو چکا

ہو گا۔ تیل کے ذخیرے میں آگ لگا دی جائے گی اور قلعہ ریت کے تودے کی طرح بیٹھ جائے گا پھر فتح ہماری ہے۔ جب تک فدائین کا مکمل صفایا نہیں ہوتا فارس میں امن قائم نہیں ہو سکتا"۔

حسن الموت کے دفاع کے منصوبے بنا رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ زیر زمین قلعے میں جا کر حالات کا جائزہ لینے لگا اس نے ایک خاص حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"یہی وہ جگہ ہے جہاں سے وہ اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ یہاں کافی تعداد میں ہم اپنے مسلح سپاہی تعینات کر دیں تاکہ جیسے ہی وہ اندر داخل ہونے کی کوشش کریں ان کا صفایا کر دیا جائے"۔ حسن کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ مشاق قاتلوں کی ایک جماعت وہاں تعینات کر دی گئی۔ وہ تاریکی میں شہزادہ مالک کی فوجوں کا انتظار کرنے لگے۔ وقت گزرتا رہا۔ چٹان توڑنے کی آواز قریب سے قریب تر آتی گئی۔ حسن پریشان ہونے لگا۔ احمد اور اس کی فوجیں کہاں ہیں؟ اگر وہ چٹان میں راستہ بننے سے پہلے آجاتی ہیں تو مالک کو وادی میں لڑنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے ورنہ....

حسن پریشان اور بے چینی کے عالم میں زیر زمین قلعے سے نکل کر اوپر چھت پر چلا گیا۔ اس نے ملکہ زاردہ کے قریب جا کر کہا۔"آپ کا بیٹا احمد اور اس کی فوجیں کہاں ہیں؟ ہم کب تک ان کا انتظار کرتے رہیں؟"

ملکہ زاردہ نے دور کہیں دیکھتے ہوئے کہا۔"وہ آئے گا۔ ضرور آئے گا"۔

حسن پھر زیر زمین حصے میں واپس آگیا۔ چٹان توڑنے کی آواز مزید قریب آگئی تھی۔ وہ ایک بار پھر چھت پر جا کر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا شہزادہ احمد اور اس کی فوجوں کا دور دور تک کہیں کوئی پتہ نہیں تھا۔ نیچے وادی میں اس کے دشمن دندناتے پھر رہے تھے۔ اچانک حسن ہذیانی انداز میں چیخنے لگا۔"احمد نہیں آئے گا۔ کبھی نہیں آئے گا۔ ہم اس کا انتظار کیوں کریں۔ کیوں کریں؟"۔ پھر وہ اپنے لوگوں سے مخاطب ہوا۔"ہمیں اپنی سمت سے سرنگ کھودنا شروع کر دینا چاہیئے تاکہ ہم دشمنوں کا مقابلہ کر سکیں"۔

اس کے تمام کارندے اور دوسرے لوگ فوراً اکٹھا ہوئے انہوں نے اپنے آدمیوں کو کدالیں اور آہنی سلاخیں وغیرہ مہیا کر دیں اور زمین میں قلعے کے اندر سے سرنگ کھودنے پر مامور کر دیا۔ تمام لوگ جانفشانی کے ساتھ سرنگ کھودنے میں لگ گئے۔

غروب آفتاب کے وقت جبکہ سورج کی کرنیں چوٹیوں کو آخری بوسہ دے رہی تھیں شہزادہ احمد کی فوجیں دور پہاڑوں پر نظر آئیں۔ ملکہ زاردہ انہیں دیکھ کر چھت سے چلائی۔ "وہ آگیا۔ وہ آگیا مجھے اس کے لشکر کی اڑائی ہوئی دھول نظر آرہی ہے"۔

حسن کو فوراً اوپر چھت پر بلایا گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا احمد کی فوجیں آرہی تھیں۔ اب دشمنوں کو تباہ کر دیا جائے گا۔ اس نے سوچا۔ نیچے شاہ کی فوجوں کو کام کرتے ہوئے دیکھ کر اس نے کہا۔ "دیکھو۔ وہ کس طرح کام کر رہے ہیں انہیں خبر نہیں کہ وہ محصور ہو چکے ہیں"۔ وہ اپنے دشمنوں کی تباہی کے تصور سے خوش ہو کر ہنسا۔ خیام اور اس کے آدمیوں کو اندر سے سرنگ کھودنے کی آہٹ مل گئی۔

"فدائین زیر زمین قلعے کی دیوار توڑ رہے ہیں"۔ خیام نے شہزادہ مالک اور اس کے افسروں سے کہا۔ "وہ ہماری حکمت عملی کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ وہ اس راز سے واقف نہیں کہ ہم جو سرنگ کھود رہے ہیں اس کا مقصد صرف آتشگیر مادے کے ذخیرے تک پہنچنا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم سرنگ کے ذریعہ ان پر حملہ کریں گے اس لئے مقابلے کے لئے وہ بھی اندر کی طرف سے سرنگ کھودنے میں لگ گئے ہیں ہمیں اور تیزی کے ساتھ کام کرنا چاہیئے تاکہ ہم بغیر کسی مداخلت کے آتشگیر مادے کے ذخیرے تک پہنچ جائیں"۔

خیام کے منصوبے کے مطابق بازنطینی قیدیوں کے علاوہ کچھ اور فوجیوں کو بھی سرنگ کھودنے کے کام پر مامور کر دیا گیا۔ ساری رات وہ لوگ دیوانوں کی طرح اپنے کام میں لگے رہے۔ سرنگ اور زیادہ لمبی اور گہری ہوتی گئی۔ خیام مختلف زاویوں سے سرنگ کی پیمائش کرتا اور آتشگیر مادے کے بہاؤ کے راستے کا معائنہ کرتا رہا۔

"اندر سے حسن کے لوگ بھی سرنگ کھودتے رہے تاکہ وہ دشمنوں کا مقابلہ کر کے اپنے خفیہ مرکز کو محفوظ رکھ سکیں۔

تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دونوں طرف کے آدمی اپنا کام روک کر ایک دوسرے کی آہٹ لیتے۔ درمیانی فاصلہ اب کم سے کم ہوتا جا رہا تھا اور آواز تیز سے تیز تر..... ادھر خیام اپنے آدمیوں کی کارکردگی کا جائزہ لے رہا تھا ادھر حسن۔ بہت جلد چٹان میں راستہ بن جائے گا اور اس کے آدمی دشمنوں پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اس بار کسی کو قیدی نہیں بنایا جائے گا بلکہ سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ حسن نے دل ہی دل میں سوچا۔

علی الصبح فدائین نے چٹان میں راستہ بنالیا لیکن اس راستے کو انہوں نے باہر کی طرف سے بنائی جانے والی سرنگ سے نہیں ملایا۔ حسن نے دیکھا کہ نئے بننے والے راستے کی دیواریں رس رہی ہیں اور فرش پر آتش گیر مادہ جمع ہو رہا ہے۔ اس نے فوراً اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ اس جگہ سے ایک اور راستہ بنائیں تاکہ دشمنوں کی آواز صاف طور پر سنی جاسکے۔ اس کے آدمی فوراً اس کے لئے تیار ہو گئے لیکن اس سے قبل کہ وہ اپنا کام عملی طور پر شروع کرتے انہوں نے دیکھا کہ شاہ کے آدمیوں نے بھی دوسری طرف سے راستہ بنالیا ہے۔ یہ راستہ نہایت مختصر تھا جس سے جھانک کر خیام نے فدائین کو دیکھا اور آتش گیر مادے کے ذخیرے کا جائزہ لیا پھر پیچھے گھوم کر شاہی نقیب سے بولا۔ "میں سمجھ رہا تھا کہ یہ راستہ ہمیں آتشگیر مادے کی کسی بڑے ذخیرے تک لے جائے گا لیکن یہاں یہ ذخیرہ بہت تھوڑا معلوم ہو رہا ہے۔ بہرحال اب وقت ختم ہو چکا ہے میرے ہاتھوں میں کچھ مشعلیں دیدو"۔ اس کے بعد اس نے باز نطینی قیدیوں اور دوسرے سپاہیوں سے چیخ کر کہا۔ "سرنگ صاف کر دو اور تمام لوگ باہر چلے جاؤ۔ تمہارا کام ختم ہو چکا ہے"۔

شاہی نقیب نے مشعلیں خیام کے ہاتھوں میں دے دیں۔ اس نے ان مشعلوں کے ذریعہ آتش گیر مادے کے ذخیرے میں ادھر ادھر سے آگ لگا دی۔ ذخیرے

میں آگ لگتے ہی پورا غار بھڑک اٹھا۔ پھر آگ پھیلتی اور بڑھتی چلی گئی اور دیواروں پر شعلے سانپ کی مانند لہرانے لگے۔

خیام نے دیکھا کہ فدائین بھاگ رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ خود بھی وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا... باہر نکل کر اس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ "پیچھے ہٹ جاؤ۔ اتنے میں ایک زبردست دھماکہ سنائی دیا۔ باز نطینی قیدی اور دیگر سپاہی دوڑ کر عورتوں اور بچوں کے خیموں کے پاس چلے گئے.... ملکہ شیریں اور دوسری شاہی خواتین شہزادہ مالک کو خدا حافظ کہنے کے لئے سویرے ہی اٹھ گئی تھیں۔ خیام اور شاہی نقیب بھی ان کے درمیان پہنچ گئے۔ سورج طلوع ہوتے ہی شہزادہ مالک کی فوجیں احمد کے کیمپ پر ٹوٹ پڑیں۔ احمد یہ صورتحال دیکھ کر گھبرا گیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر وہ فرار ہونا ہی چاہ رہا تھا کہ مالک نے اس کا راستہ روک لیا۔ دونوں طرف سے تلواریں چلنے لگیں۔ بالآخر شہزادہ مالک نے ایک کاری ضرب لگا کر احمد کا سر تن سے جدا کر دیا۔ فتح تکمیل تک پہنچ گئی اس کے بعد لوگوں کو ایک اور زوردار دھماکہ کی آواز سنائی دی۔ پھر لگاتار کئی اور دھماکے ہوئے جن سے زمین لرزنے لگی۔

خیام کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ فدائین نے آگ بجھانے کے لئے اس پر پانی ڈال دیا جس سے آتشگیر مادہ اور زیادہ بھڑک اٹھا اور اس کے ذخیرے میں دور دور آگ لگتی چلی گئی۔

صبح ہونے کے بعد ایک اور زوردار دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ قلعہ کی بلند و بالا دیواریں اور محرابیں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں۔ الموت کا یہ فلک بوس قلعہ جو صدیوں سے کھڑا تھا دیکھتے دیکھتے زمین بوس ہو گیا اور اس کے ملبے تلے ملکہ زادہ حسن اور دوسرے تمام فدائین دفن ہو گئے۔

پیغامبر فتح کی خبرے کر نذرس کی طرف روانہ ہو گئے۔ نوجوان شاہ مالک جب اپنی فوج کی قیادت کرتا ہوا نیشاپور پہنچا تو وہاں کے لوگوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر اس کا استقبال کیا اور اس کے حق میں نعرے بلند کئے۔ شاہ مالک اپنے ہاتھ میں مرحوم باپ

کی جنگی تلوار لئے گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے برابر میں خیام اپنے سفید عربی گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ شاہ اور خیام کے گھوڑوں کے پیچھے شاہی عورتوں اور بچوں کی سواریاں تھیں۔ اس کے بعد زخمیوں اور بیماروں کی گاڑیاں۔ اور ان سب کے پیچھے شاہی فوجیں اور باز نطینی قیدی جنہیں ان کی کارکردگی کی بنا پر آزاد کر دیا گیا تھا۔ تمام لوگ فارس کے نئے دارالحکومت نیشاپور کی طرف جا رہے تھے جو اب دشمنوں کے حملے اور فدائین کے خنجر سے محفوظ تھے۔

شیریں اپنے باغ میں تالاب کے کنارے خیام کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ آج اس کے پاس اسی طرح آیا جیسے کہ وہ پہلے آیا کرتا تھا۔ انہوں نے وہاں ایک ساتھ بیٹھ کر بلبل کو پھولوں سے گفتگو کرتے اور چاند کو اپنا نور پھیلاتے دیکھا۔ وقت گزرتا رہا۔ مگر وہ دونوں وقت کی رفتار سے بے خبر ایک دوسرے میں گم نہ جانے کب تک وہاں بیٹھے رہے۔

ایچ - ای بیٹس

(انگریزی)

خاموشی

اس اسٹیشن پر تقریباً تمام ملکوں کے پائلٹ موجود تھے ۔ اسی لیے میس کے شوروغل کو سن کر کسی نے فقرہ چست کیا ۔ "روسی بازار لگا ہوا ہے" ۔

پائلٹ ، ہالینڈ ، پولینڈ ، بلجیم ، چیکو سلواکیہ ، فرانس اور ناروے سے آئے ہوئے تھے ۔ بہت سے کنیڈا ، نیوزی لینڈ ، آسٹریلیا اور افریقہ کے بھی تھے ۔ ایک پائلٹ ویسٹ انڈیز کا بھی تھا اور ایک لیتھونیا کا جو فٹ بال کا بین الاقوامی کھلاڑی بھی تھا ۔ ایک پائلٹ انڈو چائنا کا اور ایک تاہیتی کا تھا ۔ امریکہ اور سوئٹزر لینڈ سے بھی ایک ایک پائلٹ تھا ۔ پائلٹوں کی جماعت کے بہت سے ارکان نیگرو تھے جن کے بال بہت کالے اور گھنگریالے تھے ۔ ہمارے ہاں جو لوگ تھے انھوں نے سب کچھ کیا تھا ، ہر جگہ گئے تھے ان کے پاس سب کچھ تھا مگر وہ اسے کھو چکے تھے ۔ وہ وسطی یورپ سے پہاڑ اور دنیا پار کر کے آئے تھے ۔ وہ لیبیا ، ایران اور ترکی سے آئے تھے ۔ چھوٹے چھوٹے بحری جہازوں کے ذریعے اسپین اور پرتگال سے آئے تھے ۔ ان میں ایسی مساوات تھی جو کرۂ ارض کے کسی اور حصے کے لوگوں میں نہیں تھی ۔ ان کے چہروں پر اداس خاموشی دیکھی جا سکتی تھی جو نفرت ہی کی پیدا کردہ ہو سکتی تھی ۔ ان سب کے درمیان ایک ایسا تھا جو سب سے الگ تھا اور وہ تھا چاپیک جو چیک تھا ۔ چاپیک کے بال سفید تھے ۔ وہ رات کے وقت اڑان بھرنے والا فائٹر پائلٹ تھا ، اس لیے دن کے وقت زیادہ تر وہ اپنے ہٹ ہی

میں رہتا تھا۔اس کاہٹ بہت آرام دہ تھا جس میں پیانو، ریڈیو، چھوٹا سا بلیرڈ ٹیبل اور آرام کرسیاں موجود تھیں یہ سب چیزیں مقامی لوگوں نے تحفے کے طور پر دی تھیں۔ پیانو کوئی بجاتا نہیں تھا پھر بھی وہ وہاں پڑا ہوا خوبصورت لگتا تھا۔دیواروں پر تصویریں تھیں۔لڑکیوں کی رنگین تصویریں کچھ نیم برہنہ۔کچھ بے لباس۔پائلٹ جو رات کو اڑانیں بھرتے تھے، بستروں پر لیٹے ہوئے تھے۔ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔کھانا کھا کر وہ سو جاتے یا تاش کھیلتے یا آپس میں گپ شپ لڑاتے تھے۔انھیں چونکہ بہت پرواز کرنا پڑتا تھا اس لیے وہ اکتاہٹ محسوس کر رہے تھے۔وہ نیوزی لینڈ کی آب وہوا کے بارے میں بحث کرتے اور اس کا موازنہ انگلینڈ کی آب وہوا سے کرتے۔وہ بے صبرے اور تنک مزاج تھے جیسا کہ فائٹر پائلٹ عموماً ہو جاتے ہیں۔صرف چاپیک یہ ساری چیزیں نہیں کرتا تھا۔وہ اکتاہٹ یا جھلاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔نہ تھکن یا تنک مزاجی کا شکار تھا۔وہ بلیرڈ نہیں کھیلتا تھا اور دیواروں پر ننگی لڑکیوں کی تصویروں میں بھی اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔وہ کبھی بستر پر نہیں سوتا تھا نہ کبھی تاش کھیلتا تھا، نہ کسی موضوع پر بحث مباحثہ کرتا تھا کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔وہ ہم سے دور الگ بیٹھتا۔اس کے بال سفید، چہرہ بھورا اور ہونٹ خوبصورت تھے۔بہار کی چمکتی دھوپ میں وہ جب سیاہ چشمہ لگاتا تو ایک ادھیڑ عمر پروفیسر معلوم ہوتا جو صحت یابی کے لیے کسی صحت افزا مقام پر آیا ہو۔اگر وہ آپ کو گلی میں یا بس میں، ریل گاڑی میں یا ٹرام میں نظر آجائے تو آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وہ جہاز کا پائلٹ ہو گا۔آپ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہمارے ساتھ اڑان بھرنے اور جنگ میں حصہ لینے والا چاپیک آدھی دنیا پار کر کے ہمارے درمیان آیا تھا۔

اس بار ایک اہم شخصیت اسٹیشن پر آئی۔چاپیک کو دیکھ کر اس نے دریافت کیا کہ وہ فضائیہ میں کب سے ہے؟ چاپیک نے جواب دیا۔"سر! سترہ سال سے"۔ یہ وہ وقت تھا جب ہم میں سے کچھ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور چیکوسلواکیہ نیا نیا ملک بنا تھا۔چاپیک اتنے سال فضائیہ میں رہا اور معلوم نہیں کس کس قسم کے

ہوائی جہاز اڑاتا رہا تھا اور آخر میں جب ۱۹۳۹ء کی گرمیوں میں ٹینک، پراگ میں داخل ہو گئے تھے اور فوجیں بکھر کر ادھر ادھر ہو گئی تھیں تو چاپیک بھی غائب ہو گیا تھا وہ کئی لوگوں کے ساتھ ایک لاری میں بیٹھ کر پولینڈ کے مشرق کی جانب چل پڑا تھا۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ چاپیک کے ساتھ، ماچالک نام کا ایک آدمی تھا۔ سفر کے دوران ان دنوں میں دوستی ہو گئی تھی۔ گرمیوں کے پورے موسم میں چاپیک اور ماچالک پولینڈ میں رکے تھے۔ یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ اس دوران نظر بند رکھے گئے تھے یا کیسے اور کہاں رہے تھے۔ کیونکہ چاپیک ٹوٹی پھوٹی اور مشکل الفاظ والی انگریزی بولتا تھا۔ وہ زیادہ تر چپ رہتا اور کبھی کبھی مسکراہٹ سے اس کی خاموشی ٹوٹتی۔ تمام وقت سفر جاری رہا۔ پھر جنگ شروع.... پولینڈ جنگ میں شامل۔ پھر جرمنی ایک طرف سے اور روس دوسری طرف سے آیا..... اس طرح چاپیک اور ماچالک کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں رہا تھا۔ وہ نہ یورپ کی طرف جا سکتے تھے نہ پچھم کی طرف۔ دکھن کی طرف جانے میں دیر ہو چکی تھی۔ روسیوں نے چاپیک اور ماچالک کو پکڑ لیا تھا۔ چاپیک کو قید خانے میں بھیج دیا اور ماچالک کو کام کرنے کے لئے۔ قیدی کے طور پر ان کے درجے کا تعین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت روس جنگ میں شامل نہیں تھا اور چیکوسلواکیہ کی سیاسی سطح پر کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ ان دنوں ایسا لگتا تھا کہ روس ہمارے خلاف جنگ میں شریک ہو جائے گا۔ صورتِ حال واضح نہیں تھی۔ اس دوران چاپیک قید خانے اور ماچالک کام میں لگا رہا چاپیک نے بتایا.... "سوا سال تک ہم اسی طرح رہے"۔

پھر جنگ کی صورتِ حال صاف ہو گئی اور آخر کار چاپیک کو قید خانے اور ماچالک کو بیگار کے کام سے نجات مل گئی۔ وہ دونوں پھر ساتھ ہو گئے وار دوست بن کر دکھن کی طرف "بلیک سی" چلے گئے۔

سیاہ چشمہ لگائے چمکتی دھوپ میں کھڑا چاپیک اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ رہا تھا کہ وہ ایک اندھے کی مانند معلوم ہوتا ہے جو کافی دیر بعد کہیں پہنچا ہو لیکن جن کے لیے سفر محض تاریکی ہو۔ اس نے کہا.....

"بلیک سی سے میں ترکی گیا، ترکی سے شام۔ پھر قاہرہ اور پھر عدن"۔

"اور کیا ماچالک آپ کے ساتھ....؟

"ماچالک میرے ساتھ رہا لیکن صرف عدن تک۔عدن سے کشتی کے ذریعے وہ بمبئی اور میں کیپ ٹاؤن پہنچا"۔

"تو ماچالک ہندوستان گیا؟"

"انڈیا.... ہاں بہت دور ہے۔بہت دور ہے"۔

"اور تم کیپ ٹاؤن؟"

"ہاں میں کیپ ٹاؤن۔ پھر جبرالٹر اور اس کے بعد یہاں انگلینڈ"۔

"اور ماچالک؟"

"ماچالک بھی یہیں ہے۔ہم دونوں کی اسی اسکواڈرن میں پوسٹنگ ہوئی ہے"۔

اس کے بعد خاموشی طاری ہوئی اس کا تعلق حال سے ہے اور حال سے زیادہ ماچالک سے.... جنگ، قید، پھر ترکی، قاہرہ اور عدن کا سفر.... بعد ازاں طویل بحری سفر کے دوران جو ہندوستان، افریقہ اور آخر میں انگلینڈ تک پھیلا ہوا تھا۔چاپیک اور چالک دوست رہے تھے۔جب آدمی وہ زبان بولتا ہے جو اس کی اپنی نہیں ہوتی تو اس کے چھوٹے چھوٹے لفظوں میں اپنی دوستی، تکلیف اور آرام کا مشکل ہی سے اظہار کر پاتا ہے چاپیک اور ماچالک نے زیادہ تر دکھ ایک ساتھ جھیلے تھے جس کا اظہار چاپیک کے سفید بال کر رہے تھے لیکن اب ایک ایسی بات ہو گئی تھی جس کا اظہار نہیں ہو پا رہا تھا۔ چاپیک کی وحشی آنکھوں میں طویل خاموشی تھی۔اس کا دوست ماچالک مر چکا تھا۔

رات کے وقت فائٹر ہوائی جہازوں کا اڑانا آسان نہیں ہوتا۔چاپیک اور ماچالک کے لیے چیکو سلواکیہ کے تاریک قید خانے اور بیگار کیمپ سے باہر آکر اندھیرے میں لڑنا اور مشکل تھا۔ماچالک کے لیے یہ مشکل تھا اسی لیے وہ ٹیلی گراف کے ایک کھمبے سے جا ٹکرایا اور چاپیک کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی مر گیا۔چاپیک ہم سے

بات چیت نہیں کر سکتا۔ ماچالک کے آخری سفر کے بارے میں بات کرنے کے لیے اس کے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ وہ قوتِ برداشت، عزم صمیم، ایثار اور اعزاز جیسے لفظ نہیں جانتا۔ یہ وہ لفظ ہیں جن کا ذکر ہوائی اڈے پر نہیں ہوتا۔ اسے درد، دوستی اور نقصان کے لیے بھی لفظ نہیں معلوم۔ ان کا بھی ذکر وہاں نہیں ہوتا.... اور سب سے بڑھ کر اپنے لیے اور اپنے کام کے لیے جو اس نے انجام دیا تھا، وہ لفظوں کی جانکاری نہیں رکھتا تھا۔

چاپیک کے لیے میرے پاس بھی لفظ نہیں ہیں۔ اس کے سفید بالوں، گہری آنکھوں اور لمبے ہاتھوں پر نظر ڈالتے ہوئے اب میں بھی خاموش ہوں۔

سین او فاؤلین
(انگریزی)

بے گناہی

اس پورے مہینے میں راہبائیں میرے چھوٹے لڑکے کو اس کے پہلے اعتراف کے لئے تیار کرتی رہی ہیں ۔ چند دنوں میں وہ روتا ہوا سکول سے کلیسا کو جائے گا نشستوں کے درمیانی راستے کے آخری سرے پر اجنبی کمرے میں داخل ہوگا اور اس.... خاموش اور تاریک حجرے میں آتش دان کے پیچھے ایک بوڑھے پادری کا چہرہ دیکھے گا۔ وہ زرد اور پر شکن چہرے کے سامنے اپنی شرارتوں کا اقرار کرے گا۔ وہ کچھ خوف محسوس کرے گا لیکن ساتھ ہی لطف اندوز بھی ہوگا کیونکہ وہ ان چیزوں میں سے کسی پر یقین نہیں کرتا۔ اس کیلئے یہ ایک قسم کا کھیل ہے جو کہ راہبائیں اور پادری آپس میں کھیلتے ہیں۔

وہ اس پر یقین کیسے کر سکتا ہے ؟ راہبائیں اس سے کہتی ہیں کہ چھوٹے یسوع مسیح اس وقت افسردہ ہو جاتے ہیں جبکہ وہ شرارتیں کرتا ہے ۔ لیکن وہ کبھی شرارت نہیں کرتا لہذا اس سے کیا فرق پڑتا ہے ؟ اس کی بجائے اگر وہ یہ کہیں کہ وہ ان لوگوں کے لئے رنج کا باعث بنتا ہے جو کہ ہمارے گھر کے نیچے میدانوں میں رہتے ہیں ۔ تو وہ اس پر یقین بھی کرے ۔ وہ جھوٹ بولتا ہے وہ بہت بڑا جھوٹا ہے ۔ خاص طور پر جب وہ میرے ساتھ رمی کھیلتا ہے تو مجھے جتنا دھوکا دے سکتا ہے دیتا ہے ۔ جب وہ خاموش ہوتا ہے تو میں شور مچا کر اس میں اضطراب پیدا کر دیتا ہوں وہ خفا ہو جاتا ہے اس کی آنکھیں

آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں۔ اور وہ تاش کے پتے نیچے پھینک کر مجھے سور کہتا ہے۔ میں اس کے اس انداز کو بہت پسند کرتا ہوں اور اسے گلے سے لگالیتا ہوں کیونکہ اس کی یہ ادا نہایت ہی معصوم ہوتی ہے۔ رات میں جب اس کے آنسوؤں کو یاد کرتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ اس کے کمرے میں جاؤں اور بستر پر پڑے اس کے گول مٹول پیارے ہاتھوں کو جو اپنی مٹھیوں میں خزانہ دبائے معلوم ہوتے ہیں اٹھا لوں ایسا بچہ یہ کیسے یقین کر سکتا ہے کہ خدا اس سے خفا ہو گیا ہے صرف اس لئے کہ وہ جھوٹ بولتا اور اپنے باپ کو سور کہتا ہے اسے اپنے اولین اعتراف کے لئے تیار ہوتے دیکھ کر مجھے نفرت ہوتی ہے کیونکہ ایک دن وہ واقعی شرارت کرے گا۔ اور میں جانتا ہوں کہ اس دن اسے کیسا خوف آگھیرے گا۔ لیکن میں اسے روک نہیں سکتا۔

میں اس دن کو نہیں بھولا ہوں۔ جب میں نے پہلی دفعہ گناہ کیا تھا۔ برسوں سے میں اعتراف کے لئے جا رہا تھا۔ اس وقت سے جبکہ میری عمر سات سال تھی۔ اور جتنی کہ اب اس کی ہے۔ میں وہی چیز بار بار دہراتا تھا۔ جسے اب وہ دہرائے گا۔

" فادر! میں نے جھوٹ بولا.... فادر! میں فجر کی عبادت بھول گیا.... فادر! میں نے اپنے والدین کی نافرمانی کی.... اور یہی سب کچھ ہے فادر! یہ ہمیشہ سچ ہوتا ہے۔ میں نے یہ غلطیاں کی تھیں۔ لیکن اس کے لئے اتنا ہی حقیقی ہے جتنا کہ کوئی اساطیری قصہ یا مضحک رزمیہ نظم۔

کرسمس کے تھوڑے دنوں بعد ایک دھندلی اداس دوپہر میں میں ایک قدیم اور تاریک کلیسا میں جس کا نام سینٹ آگسٹائن تھا حسب معمول اعتراف کے لئے گیا۔ یہ جگہ نشیب میں شہر کے ہنگاموں سے دور، قبر کی طرح سرد اور مرطوب تھی کلیسا بہت پرانا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب گرا کہ اب گرا۔ اس چرچ کے پورچ یا عقب کی سایہ دار گیلری میں دو ایک فقیر ہمیشہ آرام کر رہے ہوتے۔ اور کوئی غریب عورت شال اوڑھے ایک گوشے میں دھیمی آواز میں عبادت کر رہی ہوتی جیسے ہوا سرگوشی کر رہی ہو۔ چرچ کا رنگ و روغن ہمیشہ صاف اور تازہ ہوتا تھا۔ لیکن فرش، چوبی، نقش و

نگار اور بینچوں کی صورت برسوں سے بگڑی ہوئی تھی۔ پادری حسبِ معمولی سیاہ آگسٹانی لباس میں ملبوس ہوتا۔ ساتھ ہی ٹوپی اور کمر بند بھی۔ ایک اجنبی کے لئے مجموعی طور پر یہ اداس جگہ تھی مگر میں اس سے اس وقت سے مانوس تھا جب میری ماں مجھے وہاں آگسٹائن کی ماں سینٹ مونیکا کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے لے گئی تھی۔ میں نے تصویر کے سامنے کی روشن قندیلیں، صحن کے تاریک گوشے منقش چھتیں اور اعتراف کے صندوق جن میں دبیزار غوانی پردے لگے ہوئے تھے بہت پسند کئے تھے۔

وہاں میں جنوری کی خنکی سے دور، سینٹ مونیکا کے آگے جھکتے ہوئے گداگروں کی روشن شمعوں کے دوران بہت خوش تھا۔ میں اپنی چھوٹی سی عبادت کی کتاب سے گناہوں کی فہرست پڑھ رہا تھا۔ ان گناہوں پر غور کرتا ہوا جن سے میں واقف تھا اور انھیں نظرانداز کرتا ہوا جن سے میں واقف نہیں تھا.... اچانک میں ایک گناہ کے نام پر رک گیا جس سے میں لاتعلق سا گزر گیا تھا۔

میں یہ سطریں لکھتے ہوئے پھر وہی خوف محسوس کر رہا ہوں جو میرے اندر اس وقت سانپ کی مانند داخل ہو گیا۔ جب مجھے اس گناہ کے متعلق علم ہوا تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ میری نظر جب ان الفاظ پر پڑی تو میں اسی طرح ڈر گیا جس طرح مجرم اپنے شانے پر پولیس کی گرفت سے ڈر جاتا ہے۔ میں دیوار کی مخالف سمت میں بیٹھے ہوئے توبہ کرنے والوں کی لمبی اور خاموش قطار میں شامل ہو گیا اور بالآخر اعتراف کے تاریک کمرے میں داخل ہوا۔ اور حسب معمول دعائے مغفرت میں حصہ لیا۔ زیر لب گناہ کا نام لیا۔ اعتراف کے حجرے کا پادری بہت ہی بوڑھا تھا۔ وہ اتنا بوڑھا اور لاغر تھا کہ برادری نے اسے دعا کرنے اور اعترافات سننے کے علاوہ کسی اور کام کی اجازت نہیں دی تھی۔ لوگ جب اسے تبلیغ کرنے کو کہتے تو وہ گھنٹوں بولتا رہتا۔ یہاں تک کہ لوگ اٹھ کر چلے جاتے۔ ملفوظات مقدسہ کا محافظ توشہ خانے سے بڑی بے بسی کے ساتھ جھانکتا اور آخر میں ایک لڑکے کو بھیجتا تاکہ وہ پادری کو روکنے کے لئے عصائے ربانی کی گھنٹی زور سے بجائے۔ میں نے دیکھا ہے کہ لڑکا بوڑھے پادری کو منبر سے

اتارنے کے لئے کم سے کم تین بار گھنٹی کے پاس ضرور آتا۔

جب بوڑھے پادری نے میری بات سن لی تو اس نے زوروں سے کراہ کی آواز بلند کی جو چرچ کے دور دراز گوشوں میں بھی ضرور سنی گئی ہو گی۔اس نے تار کی طرف اپنا چہرہ جھکایا اور مجھے اپنا بچہ کہا جیسا کہ ہر پادری اعتراف کے وقت توبہ کرنے والے کو کہتا ہے۔اس کے بعد اس نے مجھ سے سوالات شروع کئے۔میں نے اسے شمار نہیں کیا میں نے سوچا تھا کہ میں اپنا گناہ بتاؤں گا اور مجھے معاف کر دیا جائے گا کیونکہ اب تک ہر پادری نے مجھے یہی کہا تھا کہ میں ایک بہت اچھا بچہ ہوں اور پھر اپنے لئے دعا کرنے کو کہا تھا گویا میں ننھا فرشتہ تھا جس کی دعاؤں میں خاص اثر ہو..... اس کے بعد مجھے فرصت مل جاتی اور میں خوشی سے نہال ہو جاتا۔

اس کے سوالوں کے جواب میں، میں نے کانپتے ہوئے کہا کہ یہ ایک سے زیادہ بار ہوا تھا.... کتنی جلد ہم لوگ سچ کو ٹال جانے کی کوشش کر دیتے ہیں!

میں نے کہا.... "ہاں فادر! یہ دوسرے کے ساتھ ہوا تھا".... اس پر وہ زور سے کراہنے لگا تا کہ میں اس سے خاموش ہونے کی استدعا کروں اس ڈر سے کہ باہر کے لوگ اس کی آواز سن لیں گے پھر اس نے ایک ایسا سوال کیا جس سے میرے بندھے ہوئے ہاتھ پسینے میں تر ہو گئے اور تھر تھرانے لگے۔اس نے پوچھا کہ کیا میرا کوئی نقصان ہوا تھا پہلے تو میں یہ نہیں سمجھا کہ اس کا مطلب کیا ہے لیکن فوراً ہی میری نادانی کی تاریک شاہراہ سے کچھ سمجھ رینگتی ہوئی میری طرف آ گئی۔غیر واضح انداز میں میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے لڑکی سمجھ رہا تھا۔میں چیخا کہ فادر کچھ بھی نہیں ہوا تھا..... کچھ بھی نہیں.... مگر اس نے صرف سرد آہ بھری اور کہا....

"تمہیں کئی ماہ تک نہیں معلوم ہو گا"۔

میرے لئے اب فرار ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔میں اسے کوئی بھی کہانی کوئی بھی جھوٹ کہنے کو تیار تھا بشرطیکہ وہ اپنے سوالات ختم کر دیتا۔میں ے کیا کہا تھا یہ تو یاد نہیں لیکن کسی نہ کسی طرح میں نے اس بوڑھے شخص پر واضح کر دیا تھا کہ میں مرد

گناہگار ہوں۔

"میں سمجھ گیا۔ میں سمجھ گیا۔ اچھا یہ بتاؤ میرے پیارے بچے کہ وہ شادی شدہ تھی یا غیر شادی شدہ؟.... اس نے دوسرا سوال کیا۔

یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں کہ اب جب میں اسے یاد کرتا ہوں تو خوب ہنستا ہوں۔ میں نے بعض اوقات اپنے دوستوں کو بھی اس کے سوالات اور کراہوں پر ہنسایا ہے.... اور اپنے آپ پر بھی کہ میں اپنی چھوٹی چھوٹی دو ایڑیوں پر پردے کے اندر کھڑا کھڑ تال کی طرح آواز لگا رہا تھا اور میرے بعد توبہ کرنے والا شخص اس بات پر حیرت زدہ تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے لیکن تب میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا جو خار دار جھاڑیوں میں الجھ گیا تھا اور اس سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا تاکہ وہ مبارک الفاظ سن سکے اور اپنا کفارہ معلوم کر سکے۔

میں نے کیا کہا تھا اسے دہرا نہیں سکتا۔ جو کچھ مجھے یاد ہے وہ صرف یہ ہے کہ میں قطار کی نظر میں کیسے ابھرا، نشستوں کے درمیان چلتا رہا۔ یہاں تک کہ میں سینٹ مونیکا کے نور سے گزر کر گیلری کے تاریک ترین گوشے میں پہنچ گیا جہاں اتوار کے دن غریبوں اور بے سہاروں کی قطار لگی ہے۔ میں نے ہر چیز کو دھواں دھواں دیکھا۔ مومی شمعوں سے قطع نظر.... مقدس قندیل کی قرمزی لو نے مجھے گھورا۔ شال والی عورت نے مجھے دیکھ کر سرد آہ کھینچی۔ ہوا میرے ننگے گھٹنوں کے نیچے سے گزر گئی اس وقت ایک گوشے میں بیٹھا اپنی ناک کو کھجلاتا اور جسم کو نوچتا ہوا فقیر میرے مقابلے میں زیادہ پاک اور صاف تھا۔

سڑک کی عمارتیں بے رونق آسمان کے نیچے تاریک اور بھیگی کھڑی تھیں۔ شہر کے اوپر ایک ننھا سا ستارہ ٹمٹما رہا تھا.... انتہائی چمکیلا اور انتہائی دور جنتی کے کھوئی ہوئی معصومیت۔ وہ کھڑکیاں جو موسم سرما میں کارآمد ہوا کرتی تھیں اب بیکار ہو گئی تھیں۔ سمینٹ کی بھیگی ہوئی دیواریں سیاہ تھیں میں ان کے گرد گھنٹوں ٹہلتا رہا۔

جب گھر میں داخل ہوا تو میری ماں نے غصے سے دریافت کیا کہ میں کہاں تھا اور میں

نے اس کے جواب میں جھوٹ کہا جو واقعی جھوٹ تھا اس لئے کہ میں اسے دھوکا دینا چاہتا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس کے بعد میں ہر شخص کو دھوکا دیتا رہوں گا۔ کیونکہ میرے اندر کچھ ایسی چیز تھی۔ جسے کسی کو نہیں جاننا چاہئے تھا میں سیاہ رات سے خوف زدہ تھا اور مجھے دوسرے اعتراف کا سامنا کرنا تھا جس میں، میں اپنی تازہ غلط بیانیوں کا.... جو میں نے بوڑھے پادری اور اپنی ماں سے کی تھیں اقرار کرنا تھا۔

چالیس سال گزر گئے ہیں۔ اور چالیس سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا.... پھر بھی جب میں اس ننھے بچے پر نظر ڈالتا ہوں جو اپنے پیارے ہاتھوں میں دعا کی ننھی سی کتاب دبائے ہوئے ہے اور مشکل الفاظ پر اپنی ناک رگڑ رہا ہے۔ تو مجھے ہنسی نہیں آتی.... گناہوں کی فہرست پر نظر ڈالنے کے بعد مجھے دوسرے اعتراف کے تصور سے بھی اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ میں نے دوسرے پادری سے کہا تھا۔

"فادر! میں نے زناکاری کی ہے"۔

اس نے بے انتہا خلوص کے ساتھ یقین دلایا کہ میں غلط کہہ رہا ہوں اور یہ کہ مجھے اس گناہ کے بارے میں اگلے چند سالوں میں بھی کچھ واقفیت نہ ہو گی۔ مجھے یہ گناہ کرنے کے لئے شادی کرنی ہو گی.... پھر اس نے مجھے اپنے لئے دعا کرنے کو کہا اور یہ بھی کہ میں بہت اچھا بچہ ہوں.... اس کے بعد مجھے خوشی خوشی واپس بھیج دیا۔

جب میں اس کے متعلق سوچتا ہوں اور پھر اس ننھے آدم پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ دور کے روشن ستارے کی مانند نظر آتا ہے اور میں اس بوڑھے مرحوم پادری کی طرح کراہتا ہوں.... اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آیا وہ کوئی اساطیری قصہ کہہ رہا ہے۔

"فادر! میں نے جھوٹ بولا.... فادر! میں فجر کی عبادت بھول گیا۔

فادر! میں نے اپنے باپ کو سور کہا"۔

ایلوبن واؤگ

(انگریزی)

مختصر تفریح

"تم اپنے والد میں کچھ زیادہ تبدیلی نہ پاؤ گی"۔ گاڑی جب پاگل خانے کے گیٹ کے اندر مڑنے لگی تو لیڈی موپنگ نے کہا۔

"کیا وہ یونیفارم پہنے ہوئے ہوں گے؟" انجیلا نے پوچھا۔

"نہیں ڈیئر بالکل نہیں۔ انہیں بہترین قسم کی آسائشیں فراہم کی گئی ہیں"۔

انجیلا پہلی بار اپنے باپ کو دیکھنے پاگل خانے جارہی تھی۔ گزشتہ دس سال سے لارڈ موپنگ اس پاگل خانے میں داخل تھے۔ جس دن انہیں پاگل خانے میں داخل کیا گیا اس دن لیڈی موپنگ کی طرف سے سالانہ گارڈن پارٹی دی گئی تھی جس میں مختلف وضع قطع کے لوگ شریک ہوئے تھے لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ اسی دن لارڈ موپنگ نے خودکشی کی کوشش کی۔ انجیلا کی اس دن سے بڑی تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ لارڈ موپنگ نے عین پارٹی کے موقع پر ہی خودکشی کی دھمکی دی تھی۔ ان دنوں ان کی رنگت سیاہ ہو گئی تھی۔ انہیں پاگل خانے میں داخل کرنے کے بعد لیڈی موپنگ ہر موسم میں ایک بار انہیں دیکھنے جاتی ہیں اور شام کی چائے کے وقت تک واپس آجاتی ہیں۔ لارڈ موپنگ کی کافی جائیداد موجود ہے جس کی وجہ سے وہ بڑی بے فکری اور آرام کی زندگی گزار رہی ہیں۔ پاگل خانے میں لارڈ موپنگ کے کئی پڑوسی ان پر سخت معترض تھے کیونکہ انہیں رہائش کے لئے ایک علیحدہ کمرہ دیا گیا تھا جہاں ہر طرح کی آسائشیں انہیں

میسر تھیں۔

پاگل خانے کے پارک میں لوگ ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔

"یہ لوگ نچلے طبقے کے پاگل ہیں" لیڈی موپنگ نے کہا۔ "تمہارے والد جیسے لوگوں کے لئے علیحدہ ایک باغ ہے"۔

وہ دونوں ماں بیٹی ڈاکٹر کے پاس پہنچیں۔

"لارڈ موپنگ آپ لوگوں سے ملنے کے لئے بالکل تیار ہیں"۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"وہ کیسے ہیں؟"

"اوہ۔ بہت اچھے۔ چند دنوں پہلے ان کی طبیعت کچھ ناساز ہو گئی تھی لیکن مجھے یہ کہنے میں خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ اب وہ بالکل ہشاش بشاش ہیں اور اپنا زیادہ تر وقت لکھنے میں صرف کرتے ہیں"۔

اتنے میں انجیلا نے ایک آواز سنی"۔ میں کہتا ہوں کہ میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے انہیں پھر کبھی آنے کے لئے کہو"۔ یہ اس کے والد کی آواز تھی۔

دوسرا آدمی نرم لہجے میں انہیں سمجھا رہا تھا۔ "کوئی بات نہیں مل لیجئے زیادہ وقت نہیں لگے گا"۔

پھر دروازہ کھلا اور لارڈ موپنگ کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ چھوٹے قد کا ایک بوڑھا آدمی بھی تھا۔

"یہ مسٹر لورے ہیں جو تمہارے والد کے اٹنڈنٹ ہیں" لیڈی موپنگ نے اس بوڑھے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انجیلا سے کہا۔

"اٹنڈنٹ نہیں سیکریٹری"۔ لارڈ موپنگ نے تصحیح کی اور آگے بڑھ کر اپنی بیوی سے مصافحہ کیا۔

"یہ انجیلا ہے۔ کیا تمہیں انجیلا یاد ہے؟" لیڈی موپنگ نے اپنے شوہر سے پوچھا

"نہیں مجھے یاد نہیں مگر وہ چاہتی کیا ہے؟"

"ہم لوگ صرف تمہیں دیکھنے آئے ہیں"۔

"لیکن آپ لوگ بہت بے وقت آئی ہیں۔ میں اس وقت بہت مصروف ہوں"

پھر وہ اپنے سکریٹری سے مخاطب ہوئے۔"لورے! کیا تم نے پوپ کے نام میرا وہ خط ٹائپ کر دیا۔؟"

"نہیں جناب! آپ نے مجھے پہلے نیو فاؤنڈ لینڈ کی مچھلیوں کا حساب کتاب کرنے کو کہا تھا"۔

"یہ اچھا ہی ہوا۔ میرا خیال ہے کہ اب پورے مراسلے کو پھر سے لکھنا پڑے گا کیونکہ لنچ کے بعد بہت سی نئی اطلاعات پہنچی ہیں"۔ انہوں نے سکریٹری کی طرف سے اپنا رخ انجیلا کی طرف کر لیا۔

"تم دیکھتی ہو میں کس قدر مصروف ہوں تم لوگ پھر کبھی آؤ کیونکہ اس وقت تم لوگوں کی طرف توجہ نہیں کر سکتا"۔

"بہت اچھا پاپا"۔

اس کے بعد لارڈ موپنگ اپنے سکریٹری سے سمندری موسم اور اس کے اثرات و مضمرات کے متعلق باتیں کرتے ہوئے کمرے سے رخصت ہو گئے۔

"آپ نے دیکھا۔ وہ اب کتنی اچھی حالت میں ہیں"۔ ڈاکٹر نے لیڈی موپنگ سے کہا۔"ان کا وزن بڑھ رہا ہے اور وہ قاعدے سے کھاتے ہیں اور سوتے ہیں"۔

دروازہ پھر کھلا اور لورے واپس آیا۔"میری واپسی کے لئے مجھے معاف فرمائیں لیکن میں اس لئے آگیا کہ یہ نوجوان لڑکی اس بات سے پریشان ہو گی کہ لارڈ صاحب نے اسے نہیں پہچانا۔ مس آپ کو اس کا کچھ خیال نہیں کرنا چاہئے آئندہ وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ آج وہ بہت مصروف ہیں۔ پچھلے ایک ہفتے سے میں بھی ان کے ساتھ مصروف ہوں کیونکہ مجھے رپورٹیں وغیرہ ٹائپ کرنی ہیں"۔

"کتنا اچھا آدمی ہے!" ڈاکٹر نے کہا۔

"ایسے وارڈن کا ملنا بھی ایک بڑی بات ہے" لیڈی موپنگ بولیں۔"لوگ جو

ناواقف ہیں اس پاگل خانے کے بارے میں خواہ مخواہ ایسی ویسی باتیں کرتے ہیں"۔

"ہاں مگر لورے وارڈن نہیں ہے"۔ڈاکٹر بولا ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ بھی ایک مریض ہی ہے اور گزشتہ پچتیس سال سے یہاں ہے"۔

"لیکن مجھے یہاں کے لوگوں میں اس سے زیادہ کوئی معقول نظر نہیں آتا"۔ انجیلانے کہا۔

"ہاں یہ ضرور ہے"۔ڈاکٹر نے کہا۔"اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ پینتیس برسوں میں ہم لوگوں نے کافی توجہ اور محنت سے اس کا علاج کیا ہے۔وہ اس جگہ کی زندگی اور روح ہے گو وہ پرائیویٹ مریضوں میں سے نہیں لیکن ہم لوگوں نے اسے پرائیویٹ مریضوں سے ربط ضبط رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔وہ بلیرڈ بہت اچھا کھیلتا ہے۔لوگوں کے گراموفون مرمت کرتا ہے اور معمے حل کرنے میں ان کی مدد کرتا ہے لوگ اسے بخششیں دیتے ہیں جس سے میرا خیال ہے کہ اب تک اس کے پاس کافی رقم جمع ہو چکی ہو گی"۔

"مگر وہ اب یہاں کیوں ہے؟"

"اوہ یہ بہت غمناک داستان ہے۔جب وہ بالکل نوجوان تھا تو اس نے ایک عورت کا جو اس کے لئے بالکل اجنبی تھی قتل کر دیا تھا۔قتل کا طریقہ یہ تھا کہ اس نے اس عورت کی سائیکل توڑنے کے بعد اس کا گھلا گھونٹ دیا۔اس کے بعد اس نے ہوش وحواس کھو دیئے اور اس وقت سے اب تک یہاں ہے"۔

"لیکن اب تو وہ بالکل محفوظ ہے۔اسے آزاد کیوں نہیں چھوڑ دیا جاتا؟"

کوئی اس میں دلچسپی لینے والا ہوتا تو ایسا کیا جا سکتا تھا۔لیکن اس کا کوئی بھی رشتہ دار نہیں سوائے ایک سوتیلی بہن کے جو پلائی ماؤتھ میں رہتی ہے پہلے وہ اسے دیکھنے آیا کرتی تھی۔لیکن ادھر برسوں سے وہ بھی نہیں آئی وہ یہاں بہت خوش ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم لوگ اسے یہاں سے نکلنے میں پہل نہیں کریں گے وہ ہمارے لئے بہت مفید ہے"۔

"مگر یہ کوئی اچھی بات تو نہیں" ۔انجیلا نے خیال ظاہر کیا۔
"اپنے والد کو دیکھئے وہ لورے کے بغیر بالکل گم ہو کر رہ جائیں گے"۔
"پھر بھی یہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا"۔

ooo

انجیلا پاگل خانے سے آئی ۔اس احساس کے ساتھ کہ اس کی ماں کا رویہ اس کے باپ کے ساتھ نہایت غیر ہمدردانہ ہے۔

ذرا اس بات کا تصور کیجئے کہ کوئی زندگی بھر ایک پاگل خانے کی چہار دیواری میں قید رہے"۔

انجیلا نے اپنی ماں سے کہا۔

"انہوں نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی"۔لیڈی موپنگ نے جواب دیا۔

"میں پاپا کے بارے میں نہیں مسٹر لورے کے بارے میں کہہ رہی ہوں"۔

"میں نہیں سمجھتی کہ میں اسے جانتی ہوں"۔

وہی آدمی جسے پاپا کی دیکھ بھال پر مامور کیا گیا ہے"۔

"تمہارے والد کا سکریٹری ؟وہ تو بہت اچھا آدمی ہے"۔

دوسرے دن لنچ پر انجیلا نے سوال کیا۔"ممی پاگل خانے سے کسی کو نکالنے کے لئے کیا کرنا پڑتا ہے"۔

"کیسی بات کرتی ہو بیٹی ۔کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہارے پاپا کی واپسی ممکن ہے؟"

"نہیں نہیں مسٹر لورے"۔

"انجیلا مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم دیوانی ہوتی جا رہی ہو ۔مجھ سے غلطی ہوئی جو میں تمہیں پاگل خانے لے گئی"۔

لنچ کے بعد انجیلا لائبریری میں چلی گئی اور وہاں کتابوں کے مطالعے میں کھو گئی۔

پندرہ دنوں کے بعد انجیلا نے گاڑی نکالی اور سیدھی پاگل خانے کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے مسٹر لورے سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ لورے اس وقت اپنے ایک ساتھی کے لئے تاج بنانے میں مصروف تھا۔ جو سمجھتا تھا کہ بہت جلد شہنشاہ برازیل کی حیثیت سے اس کی تاج پوشی ہونے والی ہے۔ پھر بھی کچھ دیر کے بعد وہ آیا اور انجیلا سے بات چیت کرنے لگا۔ انجیلا نے کہا۔ "تم یہاں سے کبھی نکلنا نہیں چاہتے؟"

مسٹر لورے نے اپنی نیلی آنکھوں سے اسے گھور کر دیکھا "میں اس زندگی کا عادی ہو گیا ہوں۔ مجھے یہاں کے لوگ پسند ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ لوگ بھی مجھے پسند کرتے ہیں۔ اگر میں چلا گیا تو وہ لوگ میری کمی محسوس کریں گے"۔

"لیکن کیا تم آزاد زندگی گزارنا نہیں چاہتے؟"۔

"ہاں مس میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں۔ اکثر سوچتا ہوں لیکن...."

"تم یہاں سے نکلنے کے بعد کیا کرو گے۔ میرا مطلب ہے تمہارے ذہن میں کوئی پروگرام تو ہو گا"۔

اس بوڑھے آدمی کے چہرے پر ناگواری کے آثار پیدا ہو گئے۔ "یہ کہنا کچھ عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن میری خواہش یہی ہے کہ بہت زیادہ ضعیف ہونے سے پہلے میں ذرا گھوموں پھروں اور تفریح کروں میں اسی طرح زندگی کا لطف اٹھانا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد میں ایک اور کام کروں گا لیکن اس کے بارے میں آپ کو بتا نہیں سکتا کیونکہ ہر آدمی کی کچھ خفیہ خواہشیں ہوتی ہیں جنھیں وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ اگر میں نے اپنی خواہش پوری کر لی تو پھر اپنے کو یہاں کے لوگوں کی خدمت کے لئے وقف کر دوں گا اور اطمینان سے مر سکوں گا"۔

اس دن وہاں سے رخصت ہوتے وقت انجیلا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئی تھیں"۔ اس کے بعد انجیلا کی زندگی اور اس کے معمولات میں کافی تبدیلی آگئی جسے دیکھ کر لیڈی موپنگ نے خیال ظاہر کیا "میرا خیال ہے کہ بچی عشق میں مبتلا ہو گئی ہے لیکن

خدا کرے وہ قلاش نوجوان سے محبت نہ کرنے لگی ہو"۔

انجیلا کتابوں کے مطالعے میں مصروف رہی۔اس نے قانون اور طب کی بہت ساری کتابوں کا مطالعہ کیا۔اب اس کی زندگی کا ایک خاص نصب العین تھا جو مسٹر لورے کی رہائی کے بعد پورا ہو گیا۔پاگل خانے کے ڈاکٹر نے پہلے تو کچھ ٹال مٹول سے کام لیا لیکن پھر لورے کی رہائی پر راضی ہو گیا تھا۔

مسٹر لورے کے اعزاز میں ایک الوداعی تقریب منعقد کی گئی جس میں پاگل خانے کے تمام لوگوں نے شرکت کی۔

لارڈ موپنگ کو افسوس تو ہوا لیکن انہوں نے بھی لورے کو پاگل خانے کے خوشحال مریضوں کی طرف سے سونے کا ایک سگریٹ کیس پیش کیا۔اس آدمی نے جو خود کو شہنشاہ سمجھتا تھا لورے کو خطابات اور تحفوں سے نوازا۔اسی طرح دوسرے لوگوں نے بھی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نہ کچھ دیا جن کے پاس دینے کے لئے کچھ نہیں تھا انہوں نے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیا۔

ڈاکٹر نے الوداعی تقریب میں کہا۔"مسٹر لورے!آپ یہاں سے جا رہے ہیں لیکن ہم آپ کی کمی ہمیشہ محسوس کرتے رہیں گے اگر مستقبل میں کبھی آپ باہر کی دنیا سے اکتا جائیں تو بلا جھجک یہاں چلے آئیں ہم آپ کو خوش آمدید کہیں گے۔آپ کا عہدہ بھی آپ کو واپس مل جائے گا"۔

دوپہر کے بعد لورے وہاں سے رخصت ہو گیا لیکن تمام لوگ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ اپنی رہائی کے دو گھنٹے کے اندر ہی مسکراتا ہوا وہ واپس آ گیا ہے "میں واپس آ گیا ہوں"۔اس نے ڈاکٹر سے کہا۔"میں اب ہمیشہ کے لئے یہیں رہوں گا"۔

"لیکن مسٹر لورے!آپ بہت جلد واپس آ گئے اس قلیل عرصہ میں آپ نے کیا تفریح کی ہو گی اور زندگی سے کیا لطف اندوز ہوئے ہوں گے؟"۔

"نہیں سر!میں نے زندگی کا پورا پورا لطف اٹھایا ہے۔مجھے جس کام سے دلی مسرت حاصل ہوئی وہ کام میں نے مختصر مدت کے باوجود انجام دے دیا ہے اور اب

سکون کے ساتھ ساری زندگی یہاں کے لوگوں کی خدمت کر سکوں گا"۔

لوگوں نے بعد میں دیکھا کہ پاگل خانے سے نصف میل کے فاصلے پر ایک ٹوٹی پھوٹی سائیکل پڑی ہے۔اور اس کے قریب ہی گڑھے میں ایک عورت کی لاش پڑی ہے جسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا شناخت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ لاش لیڈی موپنگ کی ہے۔

جارج ایڈلے

(امریکی)

عورت ذات

مسز ویلس نے اپنے شوہر کے شانے سے اوور کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔ "ایک خوشخبری سنو"۔

"کیا؟ کوئی بڑی سودے بازی؟"

"نہیں ایک عورت.... آج کام کرنے والی ایک عورت آئی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ بالکل ہیرا ہے، ویسے وہ بہت کم عمر یا حسین نہیں ہے۔ میں نے جب اس سے دریافت کیا کہ تمہیں کسی رات چھٹی بھی چاہیئے تو اس نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ اس کا مطلب تم کیا سمجھتے ہو؟"

"تب تو یہ اور بھی اچھی بات ہے"۔

"وہ انٹیلیجنس آفس سے تقریباً دو بجے یہاں آئی تھی اس کے بعد اس نے باورچی خانے کو شیشے کی طرح صاف کر دیا ہے"۔

"کہاں کی رہنے والی ہے؟"

"وہ گاؤں کی رہنے والی ہے اور بہت ہی نیک ہے۔ میں نے اس پر نظر ڈالتے ہی محسوس کیا کہ ہم اس پر بھروسہ کر سکتے ہیں"۔

"اگر وہ واقعی ویسی ہی ہے جیسا کہ تم بیان کر رہی ہو تو پھر وہ جتنی بھی تنخواہ طلب کرے اسے دو۔ اس کے کمرے میں پردے وغیرہ لگوا دو، اور بازار میں کہانیوں کے

جتنے رسالے دستیاب ہیں ان کی خریداری شروع کر دو"۔

"مگر میں سمجھتی ہوں کہ وہ انہیں پڑھے گی نہیں کیونکہ جب بھی میں باورچی خانے میں جاتی ہوں وہ مجھے کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے کام کرتے ہوئے وہ کوئی گیت گنگناتی رہتی ہے"۔

"اچھا! وہ گانے بھی گاتی ہے؟"

"اگر تم پسند نہیں کرو گے تو ہم دروازہ بند رکھ سکتے ہیں"۔

کھانے کی میز بالکل شفاف تھی۔ مسز ویلس نے گھوم پھر کر تمام چیزوں کا جائزہ لیا اور پھر سلیقے اور حسن انتظام کو سراہتے ہوئے گھنٹی بجا دی۔ دوسرے ہی لمحے نئی ملازمہ اندر داخل ہوئی۔ مسٹر ویلس نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا اور ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ان کے چہرے سے حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ عورت میز کے بہت قریب آ گئی تھی۔ اس نے مسٹر ویلس پر ایک نگاہ ڈالی اور مسکرائی۔ اس اثناء میں مسٹر ویلس اپنے ماضی کے سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔

"تم ایفی وہٹلسی ہو نا؟" انہوں نے براہ راست سوال کیا۔

"آپ کا خیال غلط نہیں ہے"۔ اس عورت نے کہا

"کیا تم مجھے نہیں پہچانتیں؟" مسٹر ویلس نے پوچھا۔

"ہاں! شاید تم ایڈ ہو.... ایڈ ویلس"۔

مسز ویلس اپنی کرسی میں دھنس گئیں۔ اور حیرت سے کبھی اپنے شوہر کی طرف اور کبھی اس عورت کی طرف دیکھنے لگیں ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ مسٹر ویلس اپنی کرسی سے اٹھے اور انہوں نے میز کی دوسری جانب جا کر اس نئی ملازمہ سے ہاتھ ملایا۔ مسٹر ویلس اس وقت ایک کشمکش میں مبتلا تھے۔ ایک طرف ان کی حیثیت مالک کی تھی اور دوسری طرف ایک پرانے دوست کی۔ بہر حال انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا۔ "یہ بریزڈ کی ایفی وہٹلسی ہے۔ میں اس کے ساتھ اسکول جایا کرتا تھا۔ یہ اکثر ہمارے گھر بھی آیا کرتی تھی"۔ پھر انہوں نے

ملازمہ کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم شکاگو میں ہو"۔

"مجھے بھی مطلق خیال نہیں تھا کہ تم یہاں ہوگے"۔

"میں یہ سمجھ رہا تھا کہ تم ابھی تک برینزڈ میں ہی ہو"۔

"میں نے برینزڈ پچھلے سال نومبر میں ہی چھوڑ دیا تھا اور اب محض دو ڈالر ہفتہ کے لئے وہاں جانا نہیں چاہتی ویسے میں مسٹر سینڈرس کے یہاں خوش تھی لیکن وہ لوگ مجھے شراب پلانے کے لئے کہتے تھے اس لئے میں نے وہ جگہ چھوڑ دی"۔

"ایفی! سوپ لے آؤ"۔ مسز ویلس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

ایفی "اوہ" کہتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

"اس کا مطلب یہ ہے"۔ مسٹر ویلس نے کہا۔ "کہ ہمارا بچپن ایک ساتھ گزارا اور ہم نے ایک ساتھ ریت کے گھروندے بنائے اور ایک دوسرے کے برابر برینزڈ کے اسکول میں بیٹھے۔ وہ وہٹلسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ وہٹلسی خاندان بہت بڑا تھا اور اس خاندان سے برینزڈ کے تمام لوگ واقف تھے۔ وہٹلسی خاندان کے لوگ غریب مگر نہایت ملنسار تھے۔ ایفی بھی بہت خوش مزاج عورت ہے"۔

"تم اسے ایفی ایفی کہہ رہے ہو۔ اور وہ تمہیں ایڈ کہہ کر مخاطب کر رہی ہے"۔ مسز ویلس نے تند لہجے میں کہا۔

"تو پھر وہ مجھے کیا کہے؟"

"تم اسے بتادو کہ یہاں اسے تمہیں کسی اور طرح مخاطب کرنا ہوگا"۔

تم مجھے اس کے لئے مجبور نہ کرو، کیونکہ وہ مجھے اسکول کے زمانے سے جانتی ہے اس کے اور ہمارے خاندان کے دیرینہ تعلقات ہیں۔ میں اسے اپنے ساتھ گانے کے اسکولوں اور سینما بازاروں میں لے جاتا رہا ہوں۔ اب میں نہیں چاہتا کہ وہ برینزڈ واپس جا کر یہ شکایت کرے کہ میں اپنے ماضی کو بھول گیا ہوں یہاں تک کہ میں نے اس کو اپنا نام لینے سے بھی منع کر دیا۔ تم چھوٹے شہروں میں نہیں رہیں اس لئے وہاں کے رسم و

رواج سے واقف نہیں ہو"۔

"ہاں! مجھے خوش قسمتی سے کبھی اس کا موقع نہیں ملا"۔ مسز ویلس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "یہ شاید چھوٹے شہر میں رہنے کا ہی اثر ہے کہ وہ تمہیں بلاتکلف ایڈ کہہ رہی ہے جس کی ہمت آج تک میں بھی نہیں کر سکی"۔

"اس کی وجہ وہی ہے کہ تم برنزڈ میں نہیں رہیں"۔

"تم نے کہا کہ وہ تمہارے ساتھ گانے کے اسکولوں میں جایا کرتی تھی؟"

"ہاں مادام! آج سے بیس سال پہلے۔ برنزڈ میں تمہیں اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ تم نے تو مجھے اس وقت جانا جب تم نے مجھ سے شادی کی۔ لیکن اس سے میرا ماضی ختم نہیں ہو سکتا"۔

"مجھے تمہارے ماضی پر کوئی اعتراض نہیں ہے میں تو صرف یہ سوچ رہی تھی کہ اس ملازمہ کے اعزاز میں ایک ڈنر پارٹی دوں جس میں وہ تمہیں ایڈ کہہ کر مخاطب کرے کتنا اچھا معلوم ہوگا ہے نا؟"

مسٹر ویلس میز پر ہاتھ مارتے ہوئے زور سے ہنسے۔ "ایفی گھر کے معاملات کو مطلق خراب نہیں کرے گی"۔ انہوں نے مسز ویلس کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے ہم لوگ برنزڈ میں آداب وغیرہ کے معاملے میں کچھ کوتاہی کرتے رہے ہوں لیکن اب ہم لوگوں نے بہت کچھ سیکھ لیا ہے"۔

مسٹر ویلس نے گھنٹی بجائی۔ ایفی فوراً اندر داخل ہوئی مسٹر ویلس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا تمہیں برنزڈ سے اخبارات اور خطوط وغیرہ ملتے ہیں؟" ایفی نے مسٹر ویلس سے سوال کیا۔

"ہاں ہر ہفتے پابندی سے ملتے ہیں"۔ مسٹر ویلس نے جواب دیا۔

"بہت خوب۔ تب تو تم وہاں کے حالات سے پوری طرح باخبر رہتے ہوگے"۔

یہ کہہ کر ایفی پھر واپس باورچی خانے میں چلی گی۔ کھانے کے بعد مسز ویلس

نے اعلان کیا کہ ایفی یہاں نہیں رہ سکتی۔ اسے یہاں سے جانا پڑے گا۔ مسٹر ویلس نے اپنی بیوی کو سمجھایا کہ اسے سخت رویہ نہیں اپنانا چاہیئے، بلکہ نرمی کے ساتھ سمجھا کر ایفی کو رخصت کر دینا چاہیئے۔

ایفی باورچی خانے میں پلیٹیں صاف کر رہی تھی کہ مسٹر ویلس اس کے پاس گئے اور گھما پھرا کر بات شروع کی۔ مسز ویلس باہر کے کمرے میں بیٹھی سرگوشی کی آواز سنتی رہیں۔ مسٹر ویلس اور ایفی برینز میں گزارے ہوئے دنوں کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔

مسز ویلس کا تعلق بالٹی مور کے ٹومیلی خاندان سے تھا، اور ٹومیلی خاندان کی کوئی عورت کسی ملازمہ کو اپنی رقیب کی حیثیت سے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا تصور بھی اس کے لئے محال تھا۔ باورچی خانے سے سرگوشیوں کی آواز ابھرتی رہی۔

مسز ویلس سر سے پیر تک غصے کی آگ میں جلتی رہیں انہوں نے سوچا کہ باورچی خانے میں جا کر اس ملازمہ کی اس کی اصل حیثیت بتا دیں مگر پھر اس خیال سے کہ مسٹر ویلس ان کی اس حرکت کو غلط رنگ دے دیں گے اور ان کے جذبہ رقابت کو طنز کا نشانہ بنا ڈالیں گے وہ خاموش رہیں۔ ایفی نے نے باورچی خانے میں سگار پینے سے منع کر دیا تھا اسی لئے مسٹر ویلس بن جلا سگار منہ میں دبائے باورچی خانے کے دروازے پر کھڑے ہوئے تھے۔

" ایفی! تم ایک آدھ ماہ کے لئے لورا کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں؟ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوگی "۔ مسٹر ویلس نے کہا۔

" میں جانتی ہوں ایڈ "۔ ایفی نے جواب دیا۔ " لیکن میں کوئی راکفیلر نہیں ہوں کہ کام کاج چھوڑ کر اپنے رشتہ داروں سے ملتی رہوں۔ مجھے خود لورا سے ملنے کی خواہش ہے مگر..... "

" کوئی بات نہیں۔ میں کل تمہارے لئے برینز تک کے ٹکٹ کا انتظام کر سکتا ہوں "۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہاں تمہاری بیوی کو تکلیف ہو جائے گی۔اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ زیادہ کام نہیں کر سکتی"۔

"ایفی! تم میری دیرینہ دوست ہو اس لئے میں نہیں چاہتا کہ تم میرے گھر میں معاوضے کے عوض کام کرنے والی عورت کی حیثیت سے رہو"۔

"نہیں۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔میں نے خود کو مکمل طور پر ایک ملازمہ تصور کر لیا ہے"۔

"تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔میں چاہتا کہ تم میرے یہاں ایک دوست ایک مہمان کی حیثیت سے رہو، ملازمہ کی حیثیت سے نہیں"۔

"بیوقوف نہ بنو۔میں ملازمہ کا کام بہت اچھی طرح کر سکتی ہوں"۔

"مجھے معلوم ہے، مگر میں نہیں چاہتا کہ میری بیوی میری ایک دیرینہ دوست کو احکامات جاری کرے۔میرا خیال ہے کہ تم میرا مطلب سمجھ گئی ہو گی"۔

"پتہ نہیں، لیکن اگر تم چاہتے ہو تو میں یہ جگہ چھوڑ دوں گی"۔

"ٹھیک ہے۔میں تمہارے لئے ٹکٹ کا انتظام کر دوں گا۔تم کل ہی برنزڈ کے لئے روانہ ہو جاؤ"۔

"بہت بہتر۔تم چاہتے ہو تو میں ایسا ہی کروں گی"۔

"اگر تم واپس آئیں تو میں کہیں نہ کہیں تمہیں کام پر لگا دوں گا"۔

دوسرے دن ایفی برنزڈ کے لئے روانہ ہو گئی۔"ایڈ!" اس نے جاتے وقت کہا۔ برنزڈ کے لوگوں کو مجھے دیکھ کر سخت حیرت ہو گی"۔

"برنزڈ کے لوگوں تک میری نیک خواہشات پہنچا دینا۔اور ان سے کہنا کہ میں بالکل ویسا ہوں جیسا کہ پہلے تھا"۔

"ضرور کہہ دوں گی۔اچھا۔خدا حافظ!"

"خدا حافظ!"

مسز ویلس کھڑکی سے ایفی کو جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔"اللہ تیرا شکر ہے"۔

انہوں نے کہا۔

"ہاں!" مسٹر ویلس گویا ہوئے۔"میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ اگر وہ واپس آئے تو ہم لوگوں سے ضرور ملے"۔

"ہم لوگوں سے؟"۔مسز ویلس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں! میں نے اسے بتا دیا ہے کہ مسز ویلس تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی"۔

"واقعی تم نے اسے مدعو کیا ہے؟"

"ہاں بالکل اور مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور آئے گی"۔

"تو پھر میں کیا کروں گی؟"

"میرا خیال ہے کہ تم اس کا انتظار بخوبی کر سکتی ہوں۔گو تم بریزڈ میں کبھی نہیں رہیں"۔مسٹر ویلس نے مسکرا کر کہا۔

مسز ویلس کے دل کا سارا غبار جیسے اچانک دھل گیا اور انہوں نے اپنے شوہر کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔"ہاں! میں یقیناً اس کی کوشش کروں گی"۔

جان اپڈائک

(امریکی)

جنگل کا کوا

ساری رات برف اتنی خاموشی سے گرتی رہی کہ ان کے کرائے کے مکان کے چاروں طرف درختوں کی ٹہنیاں سفید ہو گئیں اور اس نے بے داغ صبح کے منظر میں اور زیادہ چمک پیدا کر دی۔ ایسا لگتا تھا کہ چینی خطاطی کے نمونے سیاہ مغربی لگی جھالر کی شکل میں بھورے آسمان سے لٹکا دیے گئے ہیں۔ جیک نے سوچا کہ اس نے اس سے قبل ایسا حسین منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اب برف باری رک گئی تھی اور یہ سب جیسے خواب کے عالم میں ہوا تھا۔ وہ صبح کے وقت اپنے غسل خانے میں کھڑکی سے لگا کھڑا تھا۔ گزشتہ شب اس نے اور اس کی بیوی نے اپنے مالک مکان کے ساتھ ایک نہایت ہی آراستہ قدیم طرز کے ہال میں کھانا کھایا تھا۔ سرخ اور گہرے سرخ رنگ کی شرابیں کھانے کے ساتھ آئی تھیں۔ لمبی میز پر شمعیں جل رہی تھیں۔ دو سن رسیدہ اور کسی حد تک دقیانوسی جوڑے اور بھی تھے کھانے کے بعد مرد اور عورتیں الگ الگ ہو گئیں۔ اس کے بعد مردوں نے سگریٹ اور برانڈی سے شوق کیا اور ایک بڑے کمرے میں جس کی دیواریں سبز ریشم کی طرح تھیں وہ دوبارہ عورتوں سے آملے۔ پھر عورتوں اور مردوں کے ملے جلے قہقہے اس طرح بلند ہونے لگے جیسے فانوس آپس میں ٹکرا رہے ہوں، اور آخر میں (بھورے سے ماربل پر گھڑیال کی سنہری سوئیاں تیز تیز چل رہی تھیں) سب بے دلی کے ساتھ پیچ دار زینے سے

اتر کر اس کمرے میں آ گئے جہاں دن کے وقت سفید بالوں والی میزبان چاند ماری کی تختی پر نشانہ لگا رہی تھی ۔ اس نے رنگین کاغذوں سے پگوڈے بنائے تھے ۔ دیواروں پر پھولوں سے بھرے کاغذی گلدستے فریم میں لگے ہوئے تھے ۔ کام کرنے کی میز پر ایک بہت بڑی اور بھڑکیلی بوتل رکھی تھی ۔ جیک نے ایسی بوتل کبھی نہیں دیکھی تھی اور نہ اس کا تصور ہی کیا تھا ۔

بوتل کے اوپر رکھا ہوا نیلے رنگ کا سانڈ مسرت سے بھرپور قہقہہ لگا رہا تھا ۔ خادم آتے اور اپنے کوٹ اس کے گرد لٹکا دیتے ۔ مہمانوں نے آدھی رات کے وقت رخصت ہوتے ہوئے دیکھا کہ دنیا برف سے ڈھکی ہوئی ہے ۔ برف کے باعث ان کی نظریں دور تک نہیں دیکھ سکتی تھیں ۔ مہمانوں نے شراب ، کھانے اور نغمے کی تعریف کی اور میزبان کے حسن اخلاق کے ساتھ ساتھ اس کی بیوی کی نشانہ بازی کو بھی سراہا ۔ اور اب وہ برف باری کے گن گا رہے تھے ۔ جواں سال جوڑا اپنے چھوٹے سے کرائے کے مکان میں واپس آ گیا ۔ انھوں نے ملازم کو اسی طوفانی موسم میں رخصت کیا اور ایک دوسرے کو پیار کرنے لگے ۔ چھ گھنٹے بعد جب ان کی بچی رونے لگی تو بیوی کے بجائے وہ آدمی خود اٹھا تاکہ بیوی کے آرام میں خلل نہ پڑے ۔

شراب سے آلود تولیے نے امونیا خارج کیا جس سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ کھڑکی کے شیشے نے سورج کی روشنی کو مدھم کر دیا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان پر لیمپ شیڈ میں کوئی بلب جل رہا ہے ۔ بچی کا کمرہ روشن تھا ، دیوار پر لگی تصویریں اور پھول چمک رہے تھے ۔ یہاں تک کہ کونے کھدرے بھی منور ہو گئے تھے ۔

خاموش لڑکی نے گھبرائی ہوئی حالت میں کپڑے اتارے اور اپنے باپ کے حلیے کو غور سے دیکھا ۔ بھیگے ہوئے لباس غسل اور ٹھنڈے فرش سے اس آدمی کو فرحت محسوس ہو رہی تھی اور وہ اپنے قد سے بڑا معلوم ہو رہا تھا ۔ اس کی ننگی رانیں دکھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں ۔ اس نے ہر چیز کو رنگین شیشوں سے دیکھا ۔ مدہوشی کی یاد ، کم خوابی کی کیفیت اور برف سے ڈھکی ہوئی فضا.... چونکہ اس کے تاثرات بہت گہرے تھے

اس لیے وہ خود کو سبک محسوس کر رہا تھا۔ چیختے ہوئے فرش کے برابر تصویر کی رنگین چمک دار مچھلی اور لڑکی کی اداس پر شوق نگاہوں نے اس کی تھکن کو دھو ڈالا.... مکان اگرچہ چھوٹا تھا لیکن اس میں دو غسل خانے تھے۔ اس نے اس غسل خانے کو استعمال کیا جو کہ اس کی لڑکی کے کمرے سے ملحق تھا۔ فلش چلاتو ایسا لگا کہ پورا گھر حرکت میں آگیا ہے۔ اس نے اپنی لڑکی کے کانپتے ہوئے جسم کو نہایت احتیاط سے کپڑے پہنائے اور اسے زینے تک لے آیا۔ وہاں سے وہ اوپر اپنی بیوی کے کمرے میں گیا اور دیکھا کہ اس کی بیوی نے چوڑے بستر پر اپنی پوزیشن بدل لی ہے اور اس کے پھیلے ہوئے عریاں بازو، تکیے پر پڑے ہوئے ہیں۔ بازو کے پھیلاؤ کی وجہ سے ایک طرف کا سینہ ابھرا ہوا ہے۔ رنگ سے زیادہ خوبصورت دھوپ کھڑکی کے شیشوں سے گزر کر اس کے جسم پر پڑ رہی تھی۔ جس آہستگی کے ساتھ ریشم کے کپڑے ریشم پر اترتے ہیں اسی آہستگی سے اس کی نیلی آنکھیں وا ہوئیں.....

وہ زینے کے نیچے چھپ گیا۔ بچی نے بے خیالی میں اس کی گردن پر تھپکی لگائی۔ وہ اندر سے کانپ گیا کیونکہ نیچے اندھیرا تھا اور برف باری سے پیدا ہونے والی چمک فرنیچر میں جذب ہو رہی تھی۔

گڈ مارننگ مسٹر تھرموسٹاٹ۔ دودھ والا آج دیر سے آئے گا۔ بیل اندھادھند بج رہی تھی جس سے وہ تنگ آگیا تھا۔ جس بازو پر اس نے بچی کو اٹھایا ہوا تھا وہ کھجلانے لگا.....

وہ بچی کے کھانے کا ڈبہ تلاش نہیں کر پا رہا تھا کپ بورڈ، چینی اور پلاسٹک کے رنگا رنگ چمچوں سے بھرے ہوئے تھے۔ کرسی نوک دار تھی۔ بچی کے پاؤں غلطی سے اس کے قلابے میں لگ گئے۔ انتہائی غیر یقینی کے ساتھ اس نے ایک برتن میں پانی گرم کرنے کو رکھا۔ جاڑے کا موسم ہے اس لیے بچی کو گرم کھانا دینا چاہیے.... لیکن کھانے کا ڈبہ ہے کہاں؟.... عرش اور فرش سے آواز آئی.....

اتنے میں اس کی بیوی نیلے رنگ کے ریشمی لباس میں لپٹی ہوئی پہنچی۔ وہ اپنے

شوہر کے چلے آنے کے بعد سو نہیں سکی تھی۔ فخر اور اطمینان کے ساتھ وہ آدمی اس چھوٹی میز پر بیٹھ گیا جس پر حال ہی میں روغن کیا گیا تھا۔ بچی کو اس کی خوراک مل گئی تھی۔ رنگین گلاس میں نارنگی کا رس اس آدمی کو دیا گیا.... اپنی بہن زمین کی طرح وہ عورت بھی بہت سی سہولتیں فراہم کر دیتی ہے۔ اس نے گلاس ہونٹوں سے لگایا تو اپنی بیوی کے جسم کی خوشبو انگلیوں کے پوروں پر محسوس کی۔

اس نے کھڑکی کے باہر گھور کر دیکھا۔ لان کے اس پار جنگل کسی چینی پردے کی مانند لہرا رہا تھا۔

کسی چیز کو حرکت نہیں ہوئی۔ آسمان موتیوں سے بھرے طشت اور جنگل کسی رنگین کپڑے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ محرابیں، جھرنے اور دوسری تمام چیزیں خاموش تھیں....

اس کی بیوی نے اس کے سامنے ایک ابلا ہوا انڈا توڑ کر رکھا اور ٹوسٹ کا ایک ٹکڑا گلابی پلیٹ میں بڑھایا جو کہ کھڑکی سے آتی ہوئی تھوڑی روشنی میں دھبے کی طرف معلوم ہو رہا تھا۔

باہر ایک بہت بڑا سیاہ پرندہ کوے کی طرح زور زور سے پروں کو پھڑپھڑاتا ہوا آیا۔ اس نے اپنے پاؤں جھکائے اور جنگل کی طرف اتر گیا۔

اس کے دل میں کوے کے لئے تشویش پیدا ہو گئی جو بہت بے چینی سے سطح کی تلاش کر رہا تھا اور اتھاہ گہرائی میں اپنے لیے کسی ٹھکانے کی کھوج میں تھا، وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا اور ایک درخت کی شاخ پر بیٹھ گیا۔ اس کے پر پھیل کر پھر سمٹ گئے۔ اس آدمی کی بصارت مجروح ہو گئی اور دل رقت سے بھر گیا۔

"کلیرا!".... وہ چلایا....

عورت کی تحکم سے بھری نیلی آنکھیں اس کے چہرے سے پھسل کر تیزی کے ساتھ کھڑکی پر آ گئیں جہاں اسے صرف برف ہی برف نظر آئی۔ اس کے ہاتھوں کے درمیان رکھے ہوئے کھانے سے بھاپ نکل رہی تھی....

عورت کے ہونٹ زور سے پھڑپھڑائے۔
"اپنا انڈا کھالو"۔۔

حسن عزیز الحق

(بنگالی)

دل اس کا زہریلا

شادو کا موڈ کئی روز سے ٹھیک نہیں ہے۔ وہ دنیا سے خفا ہے۔ اس لئے کہ وہ اس کے پاس جا نہیں سکتا۔ اس کا سینہ جل رہا ہے اور غم زدہ ہے۔ موسم گرما کی شام میں کٹی ہوئی فصل کے کھیت کی مانند اس کا دل مٹیالا ہے۔ وہ خزاں کی روشن صبح میں گاؤں سے پرے اونچی کیاری پر بیٹھا خشک گھاس نوچ رہا ہے، اور اس کا موڈ خراب ہے

اسے یوں بیٹھا دیکھ کر کسی نے پوچھا۔ "کیا ہے یار اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟"

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے بابا!" یہ کہہ کر شادو پھر چپ ہو جاتا ہے۔ گو وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ وہ بات کرنا نہیں چاہتا۔ ہو سکتا ہے کہ بھی خواہوں کے اور کچھ پوچھنے پر وہ بگڑ جاتا۔ یہ سوچ کر بھی خواہ بچ مچ ڈر جاتے ہیں۔ شادو کا غصہ واقعی خطرناک ہے۔ خزاں کی روشن صبح میں اس کا ذہن کیوں پراگندہ ہے یہ بات اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ خشک ہوائیں چل رہی ہیں۔ دھوپ سونے کی طرح چمک رہی ہے۔ سبزے سے بھرے میدان میں سونا دمک رہا ہے۔ مگر اس کے لئے سب کچھ غم ناک ہے۔

شادو دل ہی دل میں بڑبڑاتا ہے۔ ڈائن، ڈائن، آدمی کو کھا جانے والی ڈائن۔ میرا دماغ کھا گئی۔ مجھے کھا لیا۔ مجھے برباد کر دیا۔

ٹھیک، اسی پل اونچی کیاری کے دوسری جانب ایک لڑکی نظر آتی ہے۔ کمر پر

ایک ٹوکری لئے جس میں گوبر، ڈنٹھل لکڑیاں اور سوکھے پتے ہیں۔ لڑکی کے خشک بال ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ ساڑھی اس طرح باندھ رکھی ہے گویا سیاہ ناگن دم کے بل کھڑی ہو کر جھوم رہی ہو۔ یوں لگتا ہے گویا سیاہ فام لڑکی کبھی کیاری کے نیچے کسی بل سے نکل آئی ہو۔

شادو نے اسے کن انکھیوں سے دیکھا۔ لڑکی کی آنکھوں سے بجلی سی چمکی اور پھر اس نے پنا سر گھما لیا۔ ادھر ادھر دیکھ کر شادو نے اسے آواز دی، اے حمی ادھر آ۔ لڑکی نے سنی ان سنی کر دی۔

"حمی! اے حمی"۔

حمیدہ نے چمک کر کہا۔ "کیا ہے"۔

"قریب آ۔ بتاتا ہوں"۔ حمیدہ قریب آئی۔ شادو ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ پھر آنکھوں کو بجلی کی طرح چمکا کر بولی۔ "کیا مذاق ہے؟"

مگر شادو اسے تکتا ہی رہ گیا۔ اور شدید جذبے کے تحت اس کا جسم کانپنے لگا۔

اس کے سرخ چہرے کو دیکھ کر حمیدہ طراری سے بولی، "بیوقوفوں کی طرح بیٹھا بیٹھا کیا سوچ رہا ہے؟ تو جو کچھ ہے۔ مجھے معلوم ہے تیری ساری تیزی طراری بس میرے ہی سامنے ہے۔ باقی دنیا میں کیا ہو رہا ہے تجھے معلوم ہی نہیں۔ رحم بورگی تالا میں کشتی لڑ رہا ہے۔ تین آدمی چت کر دیئے میرے سامنے ذرا اس سے مقابلہ کر تو جانوں، تیری جان ہی ختم کر ڈالے گا۔ مرد جو کرتے ہیں اس کا پتہ تو نہیں تجھے لڑکیوں کے سامنے بہادر بنتا ہے"۔

شادو بولا۔ "مار پیٹ کرنے سے کیا فائدہ ہوگا، بتا سکتی ہے! اس گاؤں میں کون سالا ہے جو مجھے ہرائے گا، جان ہی نہ کھا جاؤں گا"۔

حمیدہ نے ناک سکیڑی، تو صرف باتوں کا دھنی ہے۔ طاقت ہے تو مقابلہ کر لے نا!"

"دیکھ حمی سویرے سویرے دماغ نہ خراب کر۔ آج اگر بھڑ گیا تو رحم کی جان

لے لوں گا"۔

"تو پھر جانا"۔

"اگر میں مقابلہ کر لوں تو تو کیا دے گی؟"

"میں یہاں پر ناچوں گی"۔

"ٹھیک؟"

چیت کے مہینے میں دوپہر کے وقت لکڑی کے ڈھیر کو آگ لگانے سے جب آگ ہا ہا کر کے جل اٹھتی ہے۔ ویسے ہی شادو کے جسم میں بھی آگ لگ گئی۔ آہستہ آہستہ وہ اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں بھینسے کی سی کیفیت دیکھ کر حمیدہ ایک پل کو خوفزدہ ہو گئی پھر اس نے کہا۔ "دیکھ کیا رہا ہے؟ بورگی تالا جانا!"

شادو کچھ بولے بغیر چلا گیا۔

بورگی تالا میں اس وقت ایک بھیڑ جمع تھی۔ رحم دھم سے اکھاڑے میں کودا۔ بھینسے کی مانند سیاہ جسم پر دونوں ہاتھ سے دھول ملی، بالوں میں مٹی ڈالی۔ اس کے بعد گوریلے کی طرح سینے پر گھونسے لگائے اور پھٹی پھٹی آواز سے چیخا "اس بار کون جوان ہے"۔

مجمع پر سکتا طاری رہا۔ پھر کانا پھوسی شروع ہوئی "اس سالے کے ساتھ بھلا لڑا جا سکتا ہے؟"۔ "ہوں، سالا شیرنی کا دودھ جو پیتا ہے۔ کیلے کے تھم کی طرح گڑا ہوا ہے"۔

ٹھیک اسی وقت شادو کو دیکھا گیا۔ تماشائی خوشی سے چیخ اٹھے۔ آیا! دکھا ایک ہاتھ۔ شادو نے کسی طرف نہیں دیکھا، کسی کی بات نہیں سنی۔ اس کی آنکھیں پختہ ارادے سے چمکیں اور وہ رحم کے پاس آکھڑا ہوا۔

"ہو جائے دوست، لگے ایک ہاتھ"۔

شادو کی آنکھوں کی طرف دیکھ کر رحم تقریباً سہم گیا۔ ایک سرد لہر ریڑھ کی ہڈی سے نیچے کی طرف دوڑی۔ لڑنے کی خواہش یکبارگی ہوا ہو گئی۔ گھگھیائی ہوئی آواز میں وہ بولا "اسی لئے تو کھڑا ہوں۔ لیکن وقت بہت زیادہ ہو گیا ہے، ابھی....."

شادو نے لوہے کے پیچکش کی طرح انگلی بڑھا کر رحم کے اڑتے ہوئے بالوں کو پکڑ لیا، دو ایک بار جھٹکا دیا، اس کے بعد بال چھوڑ کر اس کے سینے پر دو ہتھڑ مار کر بولا، "سالے ڈر گئے؟"

"اے خبردار! بدن کو ہاتھ نہ لگا۔ اگر لڑ سکتا ہے تو آ"

"آج مگر ہوشیار۔ میں غصے میں ہوں"۔ بہت تیز اور اونچی آواز میں شادو بولا۔ پہلے تو ہوشیار ہو جا۔

سب لوگوں نے کھسک کر ان لوگوں کے لئے جگہ بنا دی۔ اس امید پر کہ ایک مثالی کشتی ہو گی۔ لوگ خوش ہوئے۔ مختلف قسم کی رائیں سنی گئیں۔ آج شادو مقابلہ نہیں کر سکے گا، رحم غصے میں ہے۔ غصے میں ہوتا رہے، وہ کچھ بھی نہیں۔

جنگلی بھینسوں کی مانند دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو سرخ سرخ خونی نظروں سے دیکھا۔ شادو کے داؤ رحم جانتا تھا کہ وہ ادھر ادھر ہو کر دھڑ سے گر پڑے گا۔ سب سمجھیں گے کہ شادو نیچے گر گیا ہے۔ اس کے بعد شاید وہ شکست قبول کر لے گا۔ شادو چلا چلا کر کشتی لڑتا ہے۔ نہ شکست قبول کرتا ہے نہ لڑنا بند کرتا ہے۔ وہ جنگلی بلے کی مانند موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس کے بعد کسی ایک انتہائی لمحے میں وہ چیخ کر اپنے مقابل پر پل پڑتا ہے۔ اس کا یہ حملہ آج تک کوئی برداشت نہیں کر سکا۔ شادو کے.... ذہن کی سوچ سرگوشی بن کر اس کے ہونٹوں پر آ گئی، ڈائن ڈائن، تیری خاطر آج میں ایک آدمی کا خون کر ڈالوں گا، اس کے بعد تجھے پکڑوں گا۔

رحم شادو کے اوپر کودا شادو نیچے گر پڑا ہے۔ رحم اس کے سینے پر بیٹھا ہے۔ شادو کا گلا پکڑے ہوئے ہے۔ شادو کی آنکھیں جیسے باہر نکل آئی ہیں۔ جو لوگ آس پاس کھڑے تھے ان میں سے کوئی چیخ اٹھا، "چھڑا دو جی، مر جائے گا، شادو مر جائے گا"۔ لیکن فوراً ہی رندھے ہوئے گلے سے شادو بولا "خبردار!"۔

اس کے بعد جب ایک انتہائی لمحہ آ گیا۔ برابر طاقتیں خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے سے گتھ گئیں۔ اس وقت جبکہ سانسوں کی آواز کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی،

تماشائی دم سادھے دیکھ رہے تھے۔ پھر خاموشی ٹوٹی اور جانور کی سی ایک چیخ سنائی دی، "توڑ دی ہے جی میری کمر توڑ دی ہے، سالا شادو ہم کو مار رہا ہے۔ میں اس کا خون دیکھنا چاہتا ہوں"۔ شادو بدن کی گرد جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ رحم اس موقت زمین پہ پڑا چیخ رہا تھا۔

"کیارے اس کی کمر توڑ ڈالی؟"

شادو بولا "کہہ دیا تھا کہ آج ہوشیار، میں نے قسم کھا رکھی ہے"۔

"کیارے؟ قسم کیسی رے؟"

"ہاں ہماری ایک قسم ہے"، شادو نے کہا اور کوئی بات کئے بغیر شادو چلا گیا۔ وہ سیدھا کیاری کی طرف جانے لگا۔ اس کو واپس آتے دیکھ کر حمیدہ کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ "ہار کے آگیا نا؟" شادو خاموش رہا۔ زور زور سے سانس لیتا رہا۔

وہ بات نہیں کر رہا ہے۔ ہار کے آیا ہے نا؟" حمیدہ پھر بولی تب گمبھیر آواز میں شادو بولا، "دیکھ آجا کر رحم کی کمر توڑ دی ہے آج۔ دس دن تک سالا اٹھ نہیں پائے گا، کبھی سیدھا ہو کر چل نہیں پائے گا"۔

حمیدہ کی دونوں آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے، رحم اور غصے کے جذبے سے وہ بگڑ اٹھی۔ "یہ تو نے کیا غضب کیا رے! کمر توڑ ڈالی! اس کی"۔

"تو ہی بتا پھر میں کیا کرتا؟ میں تیری بات ذہن سے جھٹک نہیں پا رہا تھا، مجھے نیند حرام ہو گئی تھی کام میں میری طبیعت نہیں لگتی، میں کیا کروں تو ہی بتا"۔

"میں کیا بتاؤں گی؟"

"میں تجھ سے شادی کروں گا"۔

"اے مر گئی! کیا میرا شوہر زندہ نہیں ہے؟ شوہر رہتے ہوئے تجھ سے شادی کیسے کروں گی۔ اے مر گئی!"

"تو میں کیا کروں، مجھے بتا، کیا اب تو مجھ سے پیار نہیں کرتی"۔

"نہیں!"

شادو نے جسم کو جھٹکا دیا، ہاتھ میں پکڑی ہوئی ڈالیوں کو مروڑا، مسلا پھر بولا۔

"تو پھر پہلے کیوں اقرار کیا تھا"۔ حمیدہ چپ رہی۔ شادو بولتا رہا۔ "بتا میرا دل کیوں توڑا؟"

حمیدہ پھر بھی خاموش رہی۔ "میں تجھ سے شادی کروں گا"۔

"نہیں، میری شادی جو ہو گئی ہے"۔

"تو شوہر کے گھر تو گئی نہیں ہے۔ میں اس سالے کا گلا دبا دوں گا تاکہ وہ اس گاؤں میں نہ آسکے۔ تو شوہر کے گھر بھی نہیں جائے گی، میرے گھر بھی نہیں آئے گی۔ تو میں تیرا خون کر کے پھانسی چڑھ جاؤں گا"۔

"اس وقت مجھ سے شادی کیوں نہیں کی تھی؟ کھلانے کی صلاحیت نہیں ہے تجھ میں تو شادی کا شوق کیوں ہے؟" شادو لاچار آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ خزاں کی دھوپ تیز ہو گئی۔ بہت دور چیل کی آواز سنائی دی۔ طبیعت بگڑنے لگی۔ شادو کو اس کی طرح آنکھیں بند کر کے سو جانے کی خواہش ہوئی۔

تب اچانک حمیدہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رندھی ہوئی آواز میں وہ بولی،

"میری شادی جو ہو گئی ہے، میرا شوہر جو ہے۔!"

"اس سے تو تو محبت نہیں کرتی"۔

"نہیں!۔" تب شادو کو یاد آیا۔ بکری کی کھونٹ زمین میں گاڑتے ہوئے ایک دن حمیدہ نے کہا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اس دن بھی ابتدائی خزاں کی ایک صبح تھی۔ شادو پیچھے سے آکر بولا تھا۔ "حمی!" انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا سنہری دھوپ میں ایک بادل کا ٹکڑا ان کے سر پر سایہ کئے ہوئے تھا۔ اچانک بارش ہو گئی۔ بارش کے بڑے بڑے سفید قطرے چاندی کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ دھان کی بالیوں پر پانی جم گیا تھا۔ ایک سوندھی خوشبو اڑی۔

جب سے حمیدہ نے کہا تھا کہ وہ محبت کرتی ہے تب سے ہی شادو کی طبیعت خراب دکھائی دیتی تھی۔ یہ عورت چڑیل ہے، یہ عورت شیطان ہے۔ شادو نے سوچا۔ بولی کہ پیار کرتی ہوں اور شادی کر لی کسی اور آدمی سے۔ اس کی بوڑھی دادی کو کہنے گیا

تو وہ حرامزادی مجھ پر ہی بگڑنے لگی، شادی تو کرے گا کھانا دے سکے گا میری پوتی کو۔ تو خود آج کھاتا ہے تو کل کے لئے نہیں رہتا۔ تجھے بیوی کی تمنا کیوں ہے؟۔ حمی سے کہا تو وہ بھی آنکھیں گھما کر بولی۔ "ہم سے شادی کرے گا تو کھلائے گا کیا؟"

یہ بات سچ ہے۔ یہ بات سچ ہے بابو! میری جو زمین ہے اس سے میری اور میری ماں کی خوراکی کس طور تین مہینے چلتی ہے اس کے بعد سارا سال مزدوری کر کے، مختلف قسم کا دھندا کر کے چلانا پڑتا ہے۔ مجھے خود کھانا نہیں جڑتا تو تجھے مہارانی کی طرح کیسے رکھ سکتا ہوں۔!

بہت غور کرنے پر بھی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ حمیدہ کی شادی ہو گئی ٹیرا کے ساتھ۔ اس کا گھر دوسرے گاؤں میں تھا۔ آدمی کانا اور سیاہ تھا۔ گردن کوتاہ تھی۔

اس واقعے کے بعد شادو کی بیماری شروع ہوئی۔ سینہ جلنے لگا۔ دل رونے لگا۔ گرمی کی اجاڑ مٹیالی شام کی مانند اس کا برتاؤ بھی عجیب ہو گیا۔ بوڑھی ماں شادو کے چال چلن کا مفہوم نہیں سمجھ سکتی کبھی کبھی رونے لگتی، میرا لڑکا دیوانہ کیوں ہوتا جا رہا ہے جی؟

کافی رات گئے شادو گھر واپس آتا۔ چراغ کی کمزور روشنی میں ماں لڑکے کا انتظار کرتی۔ اس کے بعد فرش پر ہی سو جاتی۔

شادو سوچتا کہ ماں کا غم اس جنم میں دور نہیں کر سکا۔ سالی کھانے کی تکلیف ہی دور نہیں ہوئی۔ کئی بار گھر آ کر اس نے دیکھا کہ ماں کھانا چھپا کر بیٹھی ہے۔ شادو دریافت کرتا، "تونے کھایا ماں؟"

"کھالیا ہے بیٹے، تو کھا!"

"تو جھوٹ بول رہی ہے ماں۔ میرے لئے کھانا نہیں ہے نا؟" آدھا پیٹ کھانا کھا کر شادو اندھیرے کمرے میں پھٹے بستر پر سو جاتا۔ پھٹی ہوئی چھت کے سوراخ سے خنک آسمان دکھائی دیتا۔ آسمان کے ٹھیک اسی حصے میں کئی ستارے بے خواب کمزور آنکھوں سے اس کی جانب تکتے رہتے۔ آسمان جیسے حمیدہ کی ساڑی تھا جو وہ کبھی پہن

نہیں پائی ۔ مگر جو ساڑھی وہ ایک دن پہنے گی ۔ آسمان جیسے وہی ساڑھی تھا ۔ ستارے اس ساڑھی کے گوٹے تھے ۔ مٹی کی دیوار پر چوہے دوڑ رہے تھے ، اندھیرے میں چھپکلی ٹک ٹک بولتی ، شادو کروٹ بدلتا رہتا ۔ رات میں آشنا لمس سے آنکھیں چار کرنا چاہتا ۔ کھردرے ہاتھ سے ماں سر سہلاتی ۔ بائیں ہاتھ میں مدھم مدھم سا چراغ لئے ۔

"ارے بیٹا! تو سو کیوں نہیں رہا؟ تجھے ہوا کیا ہے مجھے بتا" ۔

"وہ تو نہیں جانتی ماں" ۔ مرتی ہوئی روشنی میں بوڑھی کے چہرے کی شکنیں ایک سنگین سوالیہ نشان کی طرح نظر آتیں ، اور آہستہ آہستہ اٹھ جاتی ۔

اسی کے کارن ایسا ہوا ۔ اس نے مجھے برباد کر دیا ۔ اس نے کیوں کہا تھا کہ مجھ سے محبت کرتی ہے ، ورنہ ایسا نہیں ہوتا ۔ مجھ سے بولی کہ محبت کرتی ہے ۔ کتنی بار مجھے اپنے گھر بلایا اس کے بعد شادی کر لی ۔

حمیدہ کی شادی سے کئی روز پہلے شادو بالآخر اس کے پاس گیا تھا ۔ التجا کی تھی ۔ منت کی تھی ۔ اپنی محبت کی دہائی دی تھی ۔ حمیدہ کو سمجھنا شادو کے لئے واقعی مشکل تھا اس نے کہا تھا ، "حمی! میں نے ایک ترکیب سوچی ہے ۔ ہم لوگ شادی کر ڈالیں ۔"

"اس کے بعد؟"

"پھر اس کے بعد کیا؟ تو بھی کچھ محنت کرے گی کسی طرح گزر ہو ہی جائے گی"

"آہا رے! کیا مذاق کیا ہے" ۔ وہ آنکھیں گھما کر بولی ۔ "جہاں میری شادی ہوئی ہے وہاں سے مجھے کیا کیا گہنا ملا ہے معلوم ہے تجھے؟ مجھے کتنی ساڑھیاں ملی ہیں جانتا ہے تجھے تو آج کھانے کو ہے تو کل نہیں ۔ کچھ بھی نہیں ۔ تیرے گھر جا کر تیری ماں کی باندی بنوں گی کیا؟" شادو ایک دم حیران رہ گیا تھا ۔ احمق کی طرح سوال کیا ۔ کیا محبت کچھ بھی نہیں ہے؟"

"اتنی پرست میں نہیں جانتی" ۔ کمر بلا کر حمیدہ جانے لگی تھی ۔ شادو چیخ پڑا ۔ "دور ہو جا ۔ دور ہو جا ۔ آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جا" ۔

شادو اس عورت کو جان جلانے والی کہتا تھا ۔ شادی کی اس نے ٹیرا سے ۔ ہاں!

اسی نے شادی کی ہے۔ کہنا چاہیئے۔ کیونکہ ایک بہری پالتو دادی کے علاوہ اس کا کوئی اور نہیں تھا۔ لیکن سب سے تعجب کی بات یہ ہے کہ حمیدہ شادی کے بعد سسرال نہیں گئی۔ بلاوجہ شوہر سے جھگڑا کرتی ہے۔ ٹیرا کبھی کبھی آتا لے جانے کی تجویز پیش کرتا، اس کے نہ جانے پر چیخ پکار کرتا۔ جائے گی کیوں نہیں حرامزادی تیرا باپ جائے گا۔ بال کا جھونٹا پکڑ کر لے جاؤں گا۔

بیچ میں حمیدہ کی دادی کھن کھنا کر چیختی "اے دیکھ! زیادہ شور نہ کر۔ میری پوتی نہیں جائے گی۔ تو کیا کر سکتا ہے؟ بڑا بہادر ہے تو؟ دس آدمی کو بلا کے ایسے جوتے لگواؤں گی تجھے کہ گاؤں سے بھاگ جائے گا"۔ چھوکرا اور زیادہ ہنگامہ کرنے کی ہمت نہ پاتا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ نہ جانے کیسا ہو گیا۔ زیادہ تر اپنے گاؤں میں نہ رہتا۔ سسرال میں جگہ نہ پانے پر تیرے میرے دروازے پر سو یا رہتا۔ دن میں مزدوری کرتا۔ اور کبھی کبھی حلق تک تاڑی پی کر اندھیرے میں حمیدہ کے گھر پر جا کر چیختا۔ "جائے گی کیوں نہیں حرامزادی یہاں تیرا کون ہے تجھے جانا ہو گا۔ بول کون سالا یہاں تیرا ہے؟ اس سالے کی گردن مروڑ دوں گا"۔

اس کی چیخ کے جواب میں حمیدہ اپنی دادی کو للکار دیتی۔ حمیدہ کی دادی سارے محلے کو سر پر اٹھا لیتی۔ کبھی کبھی ٹیرا نرم آواز میں دریافت کرتا۔ میرا قصور کیا ہے دادی؟۔ شادی کی تو بیوی کو اپنے گھر نہیں لے جاؤں گا۔ اپنی بیوی کے ساتھ گھر نہیں بساؤں گا۔ ایسی بات کبھی کسی نے سنی ہے۔ یہ تو بہت عجیب بات ہے۔

حمیدہ کی بوڑھی دادی کی ایک ہی رٹ تھی۔ میری پوتی تیرے ساتھ نہیں رہے گی۔ تو عزت کے ساتھ یہاں سے چلا جا۔

انتہائی انتقامی جذبے سے ٹیرا بگڑتا، ٹھہرو حرامزدیو! ایک روز رات میں گلا دبا کر اگر ختم نہ کر دو تو میرا نام ٹیرا نہیں۔

اس پورے معاملے کا مفہوم شادو سمجھ نہیں پاتا۔ ایک بہانہ بنا کر حمیدہ نے شادو سے شادی نہیں کی۔ کبھی کبھی حمیدہ کی آنکھوں میں عجیب چمک آجاتی۔ گہری سیاہ

آنکھوں کا خاموش راز شادو کے ذہن کو کند کر دیتا تھا۔ اس کی مسکراہٹ کو وہ سمجھ نہیں پاتا تھا۔ وہ اس سے سہم جاتا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ حمیدہ کو بالکل نہیں جانتا۔ اسے شبہ ہوتا کہ حمیدہ اصل میں چڑیل یا ناگن ہے۔ جو اس کے جیسے جوان کو پا کر کھیل کر رہی ہے۔ خواہش ہونے پر وہ اس کا سر چبا کر کھا جائے گی یا گہرا ڈنک مارے گی۔ اگر یہ بات نہیں تھی تو اس نے شادو سے شادی کیوں نہ کی؟ اور اگر تیرا سے شادی کی تھی تو ایک دن بھی اسے منہ کیوں نہیں لگایا؟ اس کی نظروں کے سامنے وہ عورت ہر لمحے اسے جلائے ڈال رہی تھی۔ شادو کا دل رونے لگتا ہے۔ سینہ جیسے جل کر خاک ہو جاتا۔ یہ سب ہونے کے باوجود وہ اسے چھوڑ نہیں پا رہا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اس کی شریر اور سوئی کی نوک کی طرح تیز آنکھوں کی چمک محبوب کے نرم آشنا لمس میں بدل جاتی۔ آنسوؤں سے بھری آنکھوں کی پتلیاں چمکنے لگتیں، اس کی اندرونی محبت جیسے آنکھوں سے ظاہر ہونے لگتی۔ محبت کے پارس کے لمس سے سب کچھ سونا ہو جاتا، اس کی آنکھوں کی پتلیاں گویا پارس منی تھیں۔ اس کو دونوں ہاتھوں سے قریب کھینچ کر کہتی، پیار کرتی ہوں، تجھے ہی پیار کرتی ہوں۔ اس کے بعد رو رو کر کہتی، میری شادی جو ہو گئی ہے! اب میں کیا کروں۔ میں نے شادی کیوں کی؟ میرے دماغ میں کیا آیا۔ تو مجھے کھینچ کر کیوں نہیں لے آیا؟

اس کی بات سن کر شادو حیرت میں پڑ جاتا۔ یہ عورت کیا بولتی ہے۔ اب اسی پر الزام ڈالنا چاہتی ہے۔ وہ کہتا۔ تب طلاق لے ڈال"۔

"نہیں، یہ نہیں ہو سکتا"۔

شادو اپنے گاؤں کے رواج کے بارے میں سوچتا، یہ بہت برا کام ہوا ہے۔ وہ شوہر کے پاس بھی نہیں جاتی میرے گھر بھی نہیں آتی۔ اس کے باوجود مجھے ہر رات پیار کرتی ہے۔ کتنا عجیب معاملہ ہے۔ اس روز رحم کی کمر توڑ کر شادو آخری فیصلہ کرنے آیا تھا۔ ذرا دیر پہلے کشتی جیت کر آنے والا شادو ایک لاچار کیڑے کی طرح ہو جاتا۔ لیکن میں کیا کروں مجھے بتا۔ میرا کچھ انتظام کر۔

شادو نے پھر جیسے حمیدہ کی آنکھوں کے پیار کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں گویا پارس منی ہوں۔ وہ جیسے ایک گہری اور وسیع محبت کے اثر سے پگھلنے لگی ہو۔ وہ بولی، "آج رات کو ہمارے گھر آنا۔ دل کی آگ تیری صحبت میں بجھاؤں گی۔ تجھے ساری بات بتاؤں گی، میں اور ضبط نہیں کر پا رہی۔ آئے گا نا آج رات میں؟ آنا، آج ضرور آنا"

کافی رات گزرنے پر شادو آہستہ آہستہ حمیدہ کے گھر کی جانب بڑھنے لگا۔ شادو کا اس وقت کھانا کھا کر سونے کا وقت تھا۔ اندھیرے نے گاؤں کو ڈھک لیا تھا۔ جیسے ایک بڑے کالے بادل نے اپنے پروں کو پھیلا کر گاؤں کو بس کے اندر چھپا لیا ہو۔ راستے کے نشیب و فراز اور اینٹ پتھروں سے شادو واقف تھا۔ خصوصاً تاریکی میں وہ اس راستے سے اس قدر آشنا تھا کہ آنکھیں بند کر کے جانے میں بھی اسے دشواری نہ ہوتی۔

حمیدہ کے گھر کی چار دیواری گر گئی تھی۔ مٹی کے برآمدے میں وہ لوگ گینڈرے پر سوئی ہوئی تھیں۔ یہ دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ اندھیرے کی عادی آنکھوں کو اندھیرے میں سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔ شادو جانتا ہے کہ اس کے جاتے ہی دادی کی نیند ٹوٹ جائے گی، بلا جھجک بوڑھی دریافت کرے گی، کون ہے؟ شادو ہے کیا؟ میں سمجھی کوئی اور ہے۔ کل تیری ماں کے پاس جاؤں گی۔ او حمیدہ اٹھ، شادو آیا ہے۔ بوڑھی پھر سو جائے گی۔

صحن پار کر کے شادو برآمدے میں داخل ہوا۔ آج دادی کی نیند نہیں ٹوٹ رہی ہے۔ حمیدہ کے سرہانے جا کر شادو نرم لہجے میں پکارتا ہے، "حمی!"

عورت گہری نیند میں ہے۔ شادو پھر پکارتا ہے، "حمی دیکھ میں آیا ہوں۔ حمی او حمی!"

حمیدہ نیند سے اچانک بیدار ہوئی۔ وہ خوفزدہ آواز میں چیختی ہے، "کون ہے؟"

"چپ چپ۔ میں ہوں شادو"۔

"تجھے ہیضہ ہو جائے۔ ہاں مردار میں چپ کیوں رہوں گی؟ دادی، دادی اٹھ جلدی۔ شادو ہمارے گھر میں اس رات کے وقت آیا ہے۔ شادو آیا ہے مجھے برباد کرنے"

"شادو حیرت سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔ اندھیرے میں حمیدہ کا چہرہ نظر نہیں آرہا لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ ناگن کی وہی ہنسی اس کی آنکھوں میں چمک رہی ہے، عورت پھن اٹھا کر جھول رہی ہے، اب فوراً ہی ڈنک مارے گی۔

دادی نیند سے اٹھتی ہے۔ وہ بھی معاملے کو سمجھ نہیں پارہی ہے۔ شادو آیا ہے تو اتنا ہنگامہ کیوں ہے، وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس کے بعد وہ بھی جیسے حمیدہ کی آواز کی بازگشت بن جاتی ہے۔ "اے غضب! شادو اس رات میں میرے گھر آیا ہے۔ میری پوتی کو برباد کرنے۔ ہائے یہ کیا بات ہے! تب چیل کی سی تیز آواز میں حمیدہ چیختی ہے، کوئی ہے؟ ذرا دیکھو آکر۔ شادو میرے کپڑے پکڑ کر کھینچ رہا ہے"۔

حیرت زدہ شادو نے دیکھا کہ تین سائے تاریکی میں سے ابھر کر گھر میں داخل ہو رہے ہیں، ان لوگوں کے قریب آنے پر اس نے ایک آدمی کو پہچانا۔ موٹی گردن والا ٹیرا تھا۔ ٹیرا کے آتے ہی حمیدہ ایک بار پھر چیخی۔ "اے دیکھو، شادو اس رات میں آکر میرے کپڑے پکڑ کے کھینچ رہا ہے۔ میں کچھ نہیں جانتی، میں تمہاری منکوحہ بیوی ہوں"۔

جب ان لوگوں نے آکر شادو کو پکڑ لیا تب بھی وہ اس ماجرے کو سمجھ نہیں پایا انتہائی غصے سے مغلوب ہو کر ٹیرا جیسے اس کا خون کر دینا چاہتا تھا۔ "سالا فاختہ کا بچہ بار بار دھان کھانے آتا ہے۔ آج تیرا حلوہ بنا ڈالوں گا"۔

شادو خاموشی سے بیٹھا رہا، اس کی آنکھوں کے سامنے آسمان کے ستارے تھر تھر کانپنے لگے۔ کمر میں ساڑھی لپیٹے ہوئے حمیدہ کا پیکر ہلکے اندھیرے میں ناگن کی طرح جھولنے لگا۔

اس نے اپنے خون میں زہر کا اثر محسوس کیا۔ حمیدہ کی مسکراہٹ میں اسے چاقو کے پھل کی چمک نظر آئی۔ اس کے دوسرے دن پنچایت بیٹھی۔ سرپنچ نے پوچھا، "حمیدہ کی دادی! کیا شادو نے حمیدہ کا کپڑا پکڑ کر کھینچا تھا؟"

"وہی بات پھر پوچھ رہے ہو۔ میں کیا جھوٹ بول رہی ہوں؟"

"اچھا حمیدہ! ٹھیک بتا تو بیٹی۔ کیا شادو نے رات میں تیرا کپڑا پکڑ کر کھینچا تھا؟"

"ہاں کھینچا تھا۔"

"ٹھیک بول رہی ہے نا"؟

"ہاں! میرا کپڑا پکڑ کر کھینچے اور میں سمجھوں گی نہیں؟ کیا بات کر رہے ہو؟"

"بس بس۔ ایک بات اور۔ ٹیرا ادھر آ تو دیکھوں"۔ "ٹیرا سرپنچ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

"تم تو بیٹے حمیدہ کے پاس نہیں رہتے، تم اس کے گھر نہیں جاتے تو تم یہ کیسے سمجھ پائے کہ آج رات شادو آئے گا"۔

"میں جانتا تھا"۔

"کیسے جانتے تھے یہی دریافت کر رہا ہوں۔ ایک ہی بات سو بار نہ بولو۔ کیسے جانتے تھے تم کو یہ بتانا ہو گا"۔

"بیوی سے میری صلح ہو گئی ہے۔ بیوی نے ہی مجھے بتایا تھا"۔

سبھوں کی سرگوشی سنائی دی، "یہ تو بڑے مزے کی بات ہے!" سرپنچ نے اس بار شادو کو بلایا، "شادو! کل تم حمیدہ کے گھر گئے تھے؟"

"گیا تھا"۔

"ارے سالا، اور سالا بولتا ہے گیا تھا"۔ کسی بزرگ نے رائے دی۔

"اس کا کپڑا پکڑ کر کھینچا تھا؟"

"کھینچا تھا"۔

"سرپنچ بہت متوازن آواز میں بولا۔ "تب اور کیا۔ سب قبول کر رہا ہے۔ مطلب یہ کہ شادو نے زیادتی کی ہے۔ اس کا فیصلہ کرنا ہے"۔

"شادو کا کوئی حامی چلایا، پھر کیا فیصلہ، حمیدہ کے گھر آج کیا شادو کتنے دنوں سے جاتا ہے۔ شاید کوئی اور بھی جاتا ہے۔ یہ بات ہم لوگ جانتے ہیں۔ سرپنچ بولا، "اچھا

تم جانتے ہو لیکن حمیدہ نے کبھی فیصلہ نہیں کروانا چاہا۔ فیصلہ چاہنے سے اس کا فیصلہ ضرور ہوتا"۔

سرپنچ نے رائے دی "تو شادو نے زیادتی کی ہے۔ اس کو دس جوتے مارے جائیں۔ کیوں جی؟"

"یقیناً یہی ٹھیک ہے"۔

میں نے دس آدمیوں کے بیچ دس جوتے کھائے۔ تاریکی میں پیپل کے درخت کی موٹی جڑ پر بیٹھے ہوئے شادو نے سوچا، اس سے کیا محبت کی جا سکتی ہے، وہ گناہ کی گٹھری ہے۔ اس سے کوئی محبت کرے گا، وہ تو ناگن ہے۔

اس کے پیچھے ایک سایہ آکر کھڑا ہو گیا۔

شادو بڑبڑا رہا ہے۔ میرا فیصلہ ٹھیک ہی ہے۔ دس آدمیوں کے سامنے ہم نے دس جوتے کھائے۔ میری جان ہی ان لوگوں نے کیوں نہ لے لی!

تب پیچھے سے آکر ایک سائے نے نرمی سے آواز دی، "اے!" شادو گھوم کر پیچھے دیکھا۔ حمیدہ کھڑی ہے سر پر آنچل رکھے نئی نویلی دلہن کی طرح۔ دونوں آنکھیں مسکرا رہی ہیں، "او سن نہیں رہا ہے کیا؟"

شادو چپ رہتا ہے۔ "مجھ سے محبت نہیں کرے گا؟ دل کا تقاضا پورا کرنے میرے پاس نہیں آئے گا؟"۔ حمیدہ پھیکی ہنسی ہنسی۔

شادو بات نہیں کرتا۔

"میرے ساتھ بات نہیں کرے گا نا؟ مجھے گالی دے رہا ہے؟" وہ اس پر بھی بات نہیں کرتا۔ "مت کر، مت کر، بات مت کر۔ عزرائیل کا دشمن، آنکھوں کا کانٹا"۔ عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی آنکھوں میں محبت نے بسیرا کر لیا۔ ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔

"آج میں شوہر کے گھر جا رہی ہوں، تیرا بچہ میرے پیٹ میں ہے، میں نے کچھ وصول کر لیا ہے"۔ وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی چلی گئی۔

رشید حیدر

(بنگالی)

باپ کا قاتل

اپنے بوڑھے باپ کے سینے میں، میں نے بے دردی سے چاقو اتار دیا۔ انہوں نے دایاں ہاتھ زخم پر رکھا اور آہستہ آہستہ دروازے پر لڑھک گئے۔ میں نے دیکھا۔ وہ بالکل خاموش اور غیر متحرک تھے۔ ہاتھ سے سینہ دبا رکھا تھا۔ ان کے سینے سے ایک قطرۂ خون بھی نکلا۔

اور پھر میں چیخنے لگا۔ میرے فعل اور احساس میں کوئی ہم آہنگی نہ تھی۔ میں اونچی آواز سے بے ربط باتیں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا وہ زندہ ہیں، ان کا شعور زائل نہیں ہوا۔ ذہن اب بھی کام کر رہا ہے اور وہ ہوش میں ہیں، لیکن اونچی اونچی باتیں سن کر بھی انہوں نے میری جانب مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں سچ مچ نالائق اولاد ہوں، اسی لیے مڑ کر مجھ پر معاف کر دینے والی نظر ڈالنا نہیں چاہتے۔

میں جانتا ہوں اتنے بڑے گناہ کی کوئی معافی نہیں۔ میرے واقف کار لوگ، دوست احباب حتیٰ کہ میری سب سے زیادہ پیاری ماں، کوئی بھی مجھے معاف نہیں کرے گا ہر شخص مجھے نفرت کی نظر سے دیکھے گا۔ میرے باپ، مجھے زندگی بخشنے والے، دنیا کے اجالے میں لانے والے، انہیں میں نے آناً فاناً اندھیرے کے لامتناہی سمندر میں پھینک دیا۔ ایک بار بھی نہ سوچا یہ کیا کر رہا ہوں۔ میری عقل جیسے جواب دے گئی۔ بے تحاشا اٹھا اور باپ پر حملہ کر دیا۔

میرے اس ہولناک گناہ کے ارتکاب سے پہلے انہوں نے مجھے طلب کیا تھا۔

"نسو، کھانا کھالو"۔

"مجھے ذرا دیر لگے گی"۔ میں نے کہلوایا۔

دیر لگنے کی بات سن کر ماں نے بلایا: "تیرے ابا بیٹھے ہیں تیرے لیے"۔

میرے اڑسٹھ برس کے بوڑھے باپ .... سفید سر، سفید داڑھی، منہ میں مصنوعی دانتوں کی دو قطاریں زیادہ دیر تک نہ چل سکتے، نہ بول پاتے ہیں، ذرا سی مشقت پر ہانپنے لگاتے ہیں.... وہ انتظار کر رہے ہیں اپنی اولاد کا، مل کر کھانا کھانے کے واسطے۔ میں طعام گاہ میں آیا۔ میری چاپ سن کر والد نے مڑ کر دیکھا، چہرے پر خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور آنکھوں کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔

میرے سامنے فوجی بیٹھا ہے، پہلو میں توپو اور اس کونے میں انو۔ یہ میرے چھوٹے بھائی بہن ہیں سگے بہن بھائی، میری رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے وہی ان کی رگوں میں ہے۔ میرے والد کی حیثیت ہم سب کے درمیان مرکز کی تھی۔ کھانا کھاتے کھاتے ہم سب کی جانب دیکھتے اور اپنی رکابی میں سے بھی کچھ دیتے جاتے تھے۔ اپنے آگے رکھے ہوئے کھانے کو اپنے بچوں میں اس طرح تقسیم کرنے میں کتنی محبت اور شفقت پوشیدہ تھی، میں بیان نہیں کر سکتا۔ ہلسہ مچھلی کا سر ان کی محبوب غذا ہے میں نہ نہ کرتا رہا، مگر انہوں نے مجھے زبردستی دے دیا۔ اپنے والد کی پسندیدہ مچھلی کے سر کا ٹکڑا کھاتے ہوئے میرے تحت الشعور میں یہ بات ایک بار بھی نہ آئی کہ میں اپنے والد کا سر کھاؤں گا۔

والد پر حملہ کرنے کے خاصی دیر بعد میں نے دیکھا ان کا سر آہستہ آہستہ سینے پر ڈھلکتا جا رہا ہے۔ غالباً موت بے حد دھیمی رفتار سے انہیں، اعتماد کے آبگینے کو چور چور کرنے والی اس سرزمین سے اٹھائے لیے جا رہی تھی میں نے ہوش و حواس میں ہونے کے باوجود انہیں تھامنے کی کوشش نہ کی جیسے میں یہی چاہتا تھا کہ وہ سسک سسک کر موت کا مزا چکھیں۔ جب سر سینے پر ڈھلک گیا، تو میں چلایا:

"یہ آپ کا ظلم ہے ہم لوگوں کی پیدائش سے لے کر آج تک کا حساب کر کے دیکھیں، آپ نے کچھ نہیں دیا"۔

میں ایک احسان فراموش اور جھوٹا فرزند ہوں، یہ سمجھنے کی کوشش میں نے نہیں کی۔ زندگی کے نئے مفہوم اور تازہ تر حالات کو انہوں نے ہمیشہ ہم لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ ایک بار پر سکون ماحول میں انہوں نے چھوٹے بچوں کی طرح رو کر ہم لوگوں کو سینے سے لگایا اور پھر ہنستے ہوئے کہا:

"جانتے ہو اگر تمہارے احساسات بھی وہی ہوتے جو میرے ہیں، تو کیا میں تمہیں گلے لگا کر سکون محسوس کر پاتا، خوشی کی ہنسی ہنس پاتا؟"

میں باپ نہیں بن سکا تھا، اسی لیے اپنی اولاد میں خود کو تلاش کرنے والی بات سمجھ میں نہ آئی تھی۔ سچ مچ زندگی ہی زندگی کو آگہی دے سکتی ہے۔ اپنی ذات سے جو حاصل کیا جاتا ہے وہ بہت قیمتی ہوتا ہے اور دوسروں کا دیا ہوا بے دلی سے قبول کرنا پڑتا ہے۔ اپنے باپ پر حملہ کرتے وقت میں نے یہ بات نہ سمجھی اور شاید سی لیے اپنے والد کے حق میں ظالم بن گیا تھا انہوں نے کہا تھا: میرے ٹوٹون کے مرنے پر تمہیں ذرا بھی دکھ نہیں ہوا میرے اور تمہاری ماں کے سینے میں جو بے چینی اور اضطراب ہے اگر تمہارا سینہ بھی اس کا امین ہوتا، تو ٹوٹون کی موت پر تم خاموش نہ بیٹھے رہتے"۔

والد نے غلط نہیں کہا۔ اس وقت غم کے سمندر میں پوری طرح ڈوبے ہونے کے باوجود انہوں نے دیکھا کہ ناریل کے درخت کا پتہ پہلے ہی کی طرح ہوا میں جھول رہا تھا۔ راستے پر رکشا، بس اور ٹرک چلے جا رہے تھے۔ گاڑی بان ترنم سے بھٹیالی گا رہا تھا اور میں سیڑھی پر خاموش بیٹھا تھا۔

میرا چھوٹا بھائی مر گیا تھا۔ اس کی موت پانی میں ڈوبنے سے واقع ہوئی۔ مرنے سے کچھ دن پہلے میں نے ٹوٹون کو ٹیر بلین کا کپڑا خرید کر دیا تھا۔ قیمتی کپڑے کا پینٹ اور جوتا بھی۔ میرا بھائی دریا میں نہانے گیا، تو لوٹ کر نہیں آیا اور جب آیا، تو وہ زندہ نہ تھا۔

بڑے بھائی کی حیثیت سے مجھے پریشانی کا جتنا اظہار کرنا چاہیے تھا اتنا واقعی نہیں کرسکا۔ میرا چھوٹا بھائی مر گیا اور میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر تھا کہ یہ کیسے ہوا؟

ایک دن پہلے میں نے اسے دوڑتے اور کھیلتے دیکھا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ دوڑتا ہوا آتا اور میرے گلے میں بانہیں ڈال کر جھولنے لگتا اور پیاری زبان میں کہتا: "بھیا، مجھے بسکٹ لے دیجئے نا"۔ میرا کم فہم شعور مجھے یقین دلاتا ہے کہ ٹوٹون مر چکا ہے، مگر پھر بھی یوں لگتا ہے جیسے وہ مجھے ابھی ابھی پکارے گا۔ مجھے موردِالزام ٹھہرانے کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ مجھے کسی طرح یقین نہیں آتا۔ یقین ہوتا، تو میرے والد یہ کیسے کہتے: "تمہیں دکھ نہیں پہنچا"۔

کیا میں حصول جائداد کی امید میں اپنے دلی غم کا اظہار نہیں کر پایا تھا؟ کیا میں دل ہی دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ بڑے بھائی کی حیثیت سے میری ایک ذمے داری کم ہو گئی؟ اے زندگی! میں تیرا ممنون ہوں تو مجھے جو شے بھی دیتی ہے، اس کی مجھے بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ میں نے کسی قسم کی کشمکش کے بغیر باپ پر حملہ کر دیا۔

کھانا کھا چکنے کے خاصی دیر بعد یہ حادثہ ہوا میں کمرے میں چلا گیا، سگریٹ سلگایا اور بہت دیر تک آرام سے پینے کے بعد پھینک دیا پھر باہر دیکھا۔ کچھ دیر تک بازار کا نظارہ کرتا رہا۔ لوگ سائیکلوں پر آجا رہے تھے۔ ان کی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اسی وقت ماں نے پکارا:

"نسو، تمہارے ابا بلا رہے ہیں"۔

نیچے آیا۔ والد اس وقت جانماز پر بیٹھے پان کھا رہے تھے۔ میں سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھو"۔

"کیا مجھ سے کچھ کہیں گے؟"

"ہاں"۔

میں الجھن میں پڑ گیا۔ ابا ایسی کیا بات کہیں گے جس کی تیاری میں کئی لمحے لگے اور اب کہنے میں اتنا وقت لے رہے ہیں۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی، پھر بولے۔

"تم تو بڑے بھائی ہو، بڑے بھائی اور باپ میں کیا فرق ہے، بتا سکتے ہو؟"

"نہیں"۔

"باپ نہ رہے، تو چھوٹے بچوں کا سارا ذمہ بڑے بھائی کو لینا پڑتا ہے"۔

"آپ کو کیسے اندازہ ہوا کہ میں ایسا نہیں کروں گا؟"

"ثبوت تو میرے پاس کوئی نہیں، مگر پتہ نہیں تمہیں یقین آئے یا نہیں۔ اس وسیع دنیا میں میں نے ایک بھی کشادہ دل نہیں دیکھا۔ لوگ اپنی غرض کے پیچھے کتے کی طرح دوڑ رہے ہیں اور اس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے"۔

"آپ مجھے کیوں اس زمرے میں شمار کرتے ہیں؟"

صرف تمہیں نہیں سبھی ایک سے ہیں اور اگر تنہا تمہیں اس زمرے میں شمار کر بھی لیا جائے، تو کوئی ہرج نہیں۔ ثبوت بھی دیا جا سکتا ہے"۔

"آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں مشتعل ہو گیا۔

دوسری طرف میرے والد کی آواز اور گمبھیر ہو گئی:

"میرا ٹوٹون مرا اور تمہیں اس سے ایک کہانی لکھنے کا مواد مل گیا"۔

میں نے سچ مچ ایک کہانی لکھی تھی۔ اپنے چھوٹے بھائی کے کردار کو لے کر، اپنی زیر طبع کتاب میں۔ دل ہی دل میں طے کیا تھا کہ ٹوٹون کے نام سے منسوب کروں گا اور لکھوں گا: "ٹوٹون کے نام جو نہانے گیا اور لوٹ کر نہ آیا اور جب آیا تو وہ زندہ نہ تھا"۔ والد کو یہ بات میری چچازاد بہن رینا سے معلوم ہوئی تھی۔ میں نے رینا سے بات چیت کے دوران میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔

"کیا تم سمجھتے ہو ایک انسان کی موت اور ایک کہانی دونوں برابر ہیں؟"

"نہیں"۔

"انسان کے احساسات کو اگر اتنی آسانی کے ساتھ قلم کی نوک سے بیان کیا جا

سکتا ہے، تو میرے سینے سے کان لگا کر سنو۔ میرا دل ٹوٹون کا سایہ نظر آئے گا چلتے چلتے یا بیٹھے بیٹھے میرے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ٹوٹون پکار رہا ہے: ابا، ابا کہاں ہے یہ آواز؟ تم بڑے بھائی ہو۔ چھوٹے بہن بھائی باپ کی شفقت کے لیے تمہارے پاس جا کر کھڑے ہوں گے۔ زندگی کے تحفظ کے لیے تم پر انحصار کریں گے"

"آپ سمجھتے ہیں میں کچھ نہیں کروں گا؟"

"نہیں بھائی یہ بات نہیں۔ یاد دلانے کی ذمے داری مجھ پر ضرور ہے، لیکن اس طرح نہیں۔ کوئی باپ نہیں چاہتا کہ اپنے مرحوم بیٹے کی یاد کو سامنے رکھ کر دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کی زندگی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرے"۔

مشتعل ہوئے بغیر اتنے دھیمے لہجے میں گفتگو کرنا انسانی زندگی کے گہرے مشاہدے کے بعد ہی ممکن ہے۔ میں بد قسمت بیٹا، باپ کے جذبات کو سمجھے بغیر تقریباً اچھل کر چیخ اٹھا: "میں آپ کی یہ علمی باتیں، یہ فضولیات سننا نہیں چاہتا"۔

"بالکل فطری، جب تم میری عمر کو پہنچو گے اور اپنے ماضی کے اوراق الٹ کر دیکھو گے، تو آج کی بات یاد آئے گی۔ تم سمجھتے ہو میں زندگی کی غلط راہ پر چل نکلا ہوں، لیکن آج جو چیز میں تلاش کر رہا ہوں کیا وہ تم لوگوں کے لیے ممکن ہے؟ نہیں، ناممکن کیونکہ میری عمر نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے میں تم لوگوں میں اپنے آپ کو تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ میں تم لوگوں کے درمیان زندہ رہنا چاہتا ہوں"۔

میرے لیے صبر کرنا ناممکن تھا، جو منہ میں آیا بکنے لگا۔ میں نے جان بوجھ کر ایک بار بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ غصے کی آخری حد پر بھی پہنچ کر حواس باختہ نہیں ہوا اور مجھے یاد آیا کہ والد چاقو سے زخمی ہوئے ہیں۔ ان کی اولاد.... میں نے جیسے ان کے سینے میں چاقو گھونپ دیا ہے وہ ہم لوگوں کے درمیان خود کو دیکھنا چاہتے تھے، لیکن میں نے اس کے بجائے شیطان کا سا کردار ادا کیا۔ زندگی کے بارے میں جو نظریہ انہیں ساری عمر عزیز رہا تھا۔ میں نے اس کے متعلق ایسی سخت

رائے کا اظہار کیا جو تیز چھری کی طرح ان کے وجود کو چیر گئی۔

جب میں نے بات شروع کی، تو وہ ایک بار اٹھ کھڑے ہوئے تھے، پھر آہستہ آہستہ دروازے پر لڑھک گئے۔

رسیک مہتا
(گجراتی)

یگانہ بیگانہ

آسمان بادلوں سے گھر گیا تھا۔ برسات کا موسم تو کب کا شروع ہو چکا تھا لیکن ہمارے ہاں بارش دیر سے شروع ہوتی ہے، تقریباً جولائی کے وسط میں، وہ دن بھی آگئے ہیں، آج صبح سے گرمی کی کوئی حد نہیں ہے، اور اس پر بادلوں سے گھرا آسمان! میری طرح چھپرا کو بھی یہ اندیشہ ہوا کہ یقیناً ابھی بارش شروع ہو جائے گی اسی لیے آواز دے دے کر اس نے کہا۔ کھانا کھا کر جلدی آفس پہنچ جائیے بارش ہو گئی تو بھیگتے ہوئے جانا پڑے گا"۔

میں دو لقمے جیسے تیسے کھا کر جلدی سے زینے اتر گیا لیکن دروازے کے پاس آتے ہی میری رفتار رک گئی۔ گھر کے چبوترے کے پاس لوگوں کا ایک چھوٹا سا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ سبھی گھیرا ڈال کر کھڑے تھے۔ میں نے دھیمے لہجے میں سوال کیا "کیا ہے؟"

چوٹی کی گرہ باندھتے اور بار بار چھاتا سنبھالتے ہوئے شیو شنکر نے جواب دیا۔
"اور کیا ہو گا آج کے زمانے میں؟"

"لیکن ہے کیا؟"

"کوئی اپنا پاپ چھوڑ گئی ہے چبوترے پر"۔ پھر وہ فوراً بھیڑ میں اپنا سر لے جاتے ہوئے بولا۔ "ہرے ہرے ہرے ہرے، سچ مچ کل جگ آگیا ہے"۔

جیسے کل جگ چھوڑ کر اور کسی زمانے میں حرامی بچے پیدا ہی نہ ہوئے ہوں،

آفس جانے کی جلدی بھول کر میں نے بھی گردن اوپر کی دیکھا تو چبوترے پر بیچوں بیچ سفید پوٹلی کی طرح کچھ پڑا ہوا ہے، قریب کھڑی ہوئی منو نے جگہ بنا دی تاکہ میں گھیرے میں جا سکوں اس نے ہنستے ہنستے کہا۔ "دیکھو تو ہی تارک بھائی کیسا اچھا ہے، ہے نا؟"

بچہ اسے نہ جانے کیوں اچھا لگا حالانکہ نومولود خوبصورت ہوتے ہوئے بھی خوبصورت دکھائی نہیں دیتا تھا اتنے میں پانی ماں نے گہری نظروں سے اسے دیکھنے کے بعد اپنے تجربے کا ثبوت فراہم کیا۔ "ابھی کا نہیں ہے۔ کوئی بیس پچیس دنوں کا لگتا ہے بلکہ ایک ماہ کا بھی ہو سکتا ہے" مجمع میں کسی نے پانی ماں کے قیاس پر چٹکی لی۔ "پانی ماں! تم اکیلی ہو، لے جاؤ نا اس بچے کو....."

"نہیں رے بھیا پرایا پاپ سنبھال کر میں جھمیلے میں کیوں پڑوں؟" وہ اس ڈر سے پیچھے ہٹ گئی کہ شاید سچ مچ اس پر بچہ سنبھالنے کا بوجھ آپڑے۔

"لیکن پھر اب اس کا کیا کیا جائے؟"

پھر سے چوٹی سنوارتے ہوئے شیو شنکر بولا۔ ابھی پولیس آئے گی، اور اسے لے جا کر کسی یتیم خانے میں چھوڑ دے گی۔ ہمیں کیا؟"

"لیکن پولیس کو کوئی خبر تو کرے، آج بادل بھی کیسے گھرے ہوئے ہیں، اگر بارش آدھمکی تو..... بیچارا!"

"ہاں بیچارا.....؟" اور میری نظریں بھی ایک ٹک اسی بیچارے پر ٹھیر گئی تھیں۔ بھورے بھورے نرم بالوں والا چھوٹا سا سر، گندھے ہوئے کچے میدے کی طرح نرم، اور ٹمٹماتی ہوئی دو گول آنکھیں!

"جھک جھک کر دیکھتے ہوئے لوگوں میں سے کسی کا سایہ ان آنکھوں پر پڑتا تو دونوں آنکھیں کھل جاتیں لیکن سایہ ہٹ جانے پر آسمان کی روشنی برداشت نہ ہو سکنے کے باعث فوراً مند جاتیں، میں نے بھی ایک آدھ بار جھک کر اسے ٹھیک سے دیکھ لیا سفید چادر کی ایک مضبوط گٹھری تھی۔ منہ چھوڑ کر کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ معلوم

ہوتا تھا کہ دو تین موٹے کپڑوں میں اچھی طرح لپیٹ کر اسے رکھا گیا ہے اور حیرت تو اس بات پر تھی کہ بچہ روتا بھی نہیں۔

اوپری منزل سے آتی ہوئی رتن کاکی نے بھی اس کے چھوٹے سے منہ پر جھک جھک کر ناک نقشے کا تجزیہ کرنے کے بعد اظہار خیال کیا یہ معلوم ہوتا ہے ماں نے خوب دودھ پلا کر رکھا ہے دیکھو نا! کب سے پڑا ہے لیکن کہیں رونے کا نام لیتا ہے؟ پھر لوٹتے ہوئے اس نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔" میں دودھ میں روئی بھگو کر لے آؤں۔ منہ میں رکھے تو سہی، بیچارا بھوکا ہوگا"۔

وہ اوپر چلی گئی۔ میری نگاہ بھی اوپر گئی۔ چھپرا ہاتھ پر تھوڑی ٹیکے کھڑکی میں کھڑی تھی۔

اتنی اونچائی سے بھی، اس کی پیاسی آنکھیں ایک ٹک ہو کر بچے پر ٹھیری ہوئی تھیں، اس کے اداس چہرے پر اداسی کے ساتھ ساتھ ہمدردی کا چشمہ ابل پڑا تھا۔ اچانک میری طرف دھیان آنے پر وہ ہنستے ہوئے بولی۔" ابھی یہیں کھڑے ہیں؟ دیر نہیں ہو رہی؟"

مجھے ہوش آیا۔ گھڑی کی طرف دیکھا تو ساڑھے دس بج چکے تھے۔ جلدی سے لفٹ رائٹ کرتا ہوا مشکل سے بیس منٹ میں آفس پہنچا دروازے پر قدم رکھتے ہی چپڑاسی نے کہا۔" صاحب آپ کو بلا رہے ہیں"۔

میں حاضری کے رجسٹر پر دستخط کرنے سے پہلے ہی جلدی سے اوپر انتونی صاحب کے کیبن میں داخل ہوا۔ انتونی صاحب محکمہ آب پاشی کے چیف انجینئر تھے، گزشتہ دس برسوں سے میں ان کے ماتحت اوورسیر کا کام کر رہا تھا۔ ڈیڑھ سو روپے سے نوکری شروع کی تھی اب تنخواہ بھی تین سو روپے ہو گئی تھی، زیادہ تر باہر کے ترقیاتی کاموں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی تھی اس لیے آفس اٹینڈ کرنا بہت کم نصیب ہوتا تھا۔ صاحب کا بھی دوسروں کی بہ نسبت میرے ساتھ بہتر سلوک تھا۔ اس لیے ذمے داری والے خاص کام مجھی کو سپرد کیے جاتے تھے، آج بھی ایسا ہی کوئی خاص کام ہوگا۔ یہ سوچ کر میں

چپ چاپ ٹیبل کے قریب کھڑا رہا۔ صاحب فائیل دیکھ رہے تھے کسی کاغذ کی تلاش تھی فائیل دیکھتے ہوئے انھوں نے کہا "بیٹھو" کچھ دیر بعد کاغذ مل جانے پر انھوں نے باہر نکالا اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارے لکھجی! نانگول کے لوگوں کی طرف سے موصول ہونے والی درخواست کی بات تو ہم بھول ہی گئے"۔

ان کے ہاتھ میں وہی درخواست تھی کچھ جھجک محسوس کرتے ہوئے میں نے کہا ہاں! لیکن اسے تو ایک برس بیت گیا"۔

صاحب ہنستے ہوئے بولے۔ "ہاں لیکن ایک سال میں بھی تو جانچ کرنا ہماری ڈیوٹی ہے۔ یا نہیں؟ اتنا کہہ کر انھوں نے وہ کاغذ میرے ہاتھ میں دے دیا"۔

بات یہ تھی کہ ایک آدھ سال پہلے نانگول کے پاس ایک بڑا تالاب بنایا گیا تھا تالاب بن جانے کے بعد گاؤں کے لوگوں کی طرف سے درخواست آئی کہ تالاب کے تعمیری کام میں ٹھیکے دار نے گڑبڑ کی ہے اور سیمنٹ اور لوہے کی چھڑوں کی بجائے بنیاد میں مٹی بھر دی ہے اس لیے بارش ہونے پر اگر بند ٹوٹ گیا تو گاؤں پر آفت آجائے گی۔

یہ درخواست موصول ہونے کے بعد بند کا معائنہ کرنے کے لیے صاحب نے مجھے نانگول بھیجا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں وہاں جا کر معائنہ کروں، برسات شروع ہو گئی۔ تالاب چھلکنے سے پہلے ہی بند ٹوٹ گیا۔ بند ٹونے سے یہ تو ثابت ہو ہی گیا تھا کہ تعمیر کا کام ٹھیک سے نہیں ہوا پھر بھی ٹھیکے دار نے اپنی مدافعت میں کہا۔ "تعمیر کا کام چل رہا تھا کہ اسی وقت بارش ہو جانے سے بند ٹوٹ گیا۔ ویسے بنیاد میں تو ایگریمنٹ کے مطابق سیمنٹ اور لوہے کی چھڑیں کافی بھری گئی ہیں"۔

اس وقت ٹوٹے ہوئے بند کی بنیاد پر تقریباً پچاس فٹ پانی تھا۔ اس لیے معائنہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ آخر یہ طے پایا کہ پانی سوکھنے پر معائنہ کیا جائے پانی تو کب کا سوکھ چکا ہو گا لیکن معائنے کی بات بھلائی جا چکی تھی، آج اچانک صاحب کو وہ بات یاد آگئی تھی وہ کھڑکی سے آسمان کی طرف دیکھ کر بولے۔ "سالا! کسی نے یاد بھی نہیں کیا۔ بارش تو آج کل میں ہونا چاہیئے"۔

میں نے کہا۔ "ہاں شاید آج ہی ہو گی"۔

انٹونی صاحب ایک دم چٹکی بجا کر بولے۔ "تم ابھی نانگول جاؤ ضرورت ہو تو کچھ لوگوں کو مدد کے لیے لیتے جاؤ اس سے پہلے کہ پھر سے بارش ہو اور بند ڈوب جائے معائنے کی پوری رپورٹ حاضر ہونی چاہیے"۔

میں نے چونک کر کہا۔ "لیکن صاحب! آج ہی بارش ہو گئی تو؟"

"بارش ہوتے ہی تالاب نہیں بھر جائے گا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دو تین روز بارش نہ ہو، اگر ایسا ہوا تو معائنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی"۔

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا میں ابھی گھر جا کر بیگ لے آتا ہوں"۔

صاحب! سر ہلا کر بول اٹھے۔ "نہیں نہیں تمھیں گھر جانے کی ضرورت نہیں، ایک ایک منٹ قیمتی ہے یہاں سے جیپ لے کر سیدھے بند کے لیے روانہ ہو جاؤ میں تمھارے گھر آدمی بھیج رہا ہوں، وہ دوسری گاڑی سے تمھارا سامان لے کر تمھیں بند پر دے آئے گا"۔ اور ہنستے ہنستے کہنے لگے۔ "وہاں پہنچتے ہی نہ آپ کو کپڑے وغیرہ کی ضرورت تھوڑی پڑے گی؟"

زیادہ حجت کی گنجائش نہیں تھی، اسی وقت میں کچھ لوگوں کو لے کر بند کے لئے روانہ ہو گیا۔ صبح سے گھر گھر آنے والے بادل دوپہر تک برسے بغیر ہی بکھر گئے تھے، شام کو تو ہوا بھی ایسی چلی کہ فوراً بارش ہونے کا امکان ختم ہو گیا، لگتا ایسا ہی تھا۔

میں نے ساتھیوں کو ہدایت دی۔ "گاؤں سے مزدوروں کو بلوا کر بنیاد کھدوانے کا کام شروع کراؤ"۔

کچھ ہی دیر میں کام شروع ہو گیا۔ میں نے مزدوروں کو دگنی مزدوری دینے کا لالچ دے کر رات کو بھی کام جاری رکھنے فیصلہ کیا۔

ویسے تو کام کی جگہ مجھے موجود رہنا چاہیے تھا لیکن آج میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، چین نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے معاون کو دیکھ بھال کا کام سونپ کر میں تالاب کے کنارے چلا گیا۔ ڈھلتی ہوئی شام کے دھندلکے میں سوکھا ویران تالاب کھانے کو دوڑتا

تھا۔ کنارے پر جا کر میں نے کچھ دیر چہل قدمی کی۔ پھر ٹھیکیدار کے نوکروں کے لیے بنائے جانے والی پترے کی جھونپڑی میں جا کر ایک بوری پر لیٹ گیا۔

رہ رہ کر نوزائیدہ بچے کا وہی بن کھلے پھول جیسا چہرہ نظروں کے سامنے تیر رہا ہے اور چھپرا کی آنکھوں کی بے چین پیاس! شادی کو سات برس بیت گئے تھے اور چھپرا کو بچہ نہیں ہوا تھا اور اب ہونے کی امید بھی نہیں رہی تھی پوری جانچ کے بعد ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا۔ "رحم کا منہ چھوٹا ہے اگر آپریشن سے اسے چوڑا کیا جائے تو حمل کا امکان ہے لیکن ولادت کے وقت خطرہ ہو سکتا ہے، شاید پیٹ چیر کر بچہ نکالنا پڑے اور ایسے میں زچہ کے لیے جان کا خطرہ ہے....!" بہت مشکل سے چھپرا کو سمجھا بجھا کر آپریشن کا خیال ترک کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے چھپرا کی اولاد کی تمنا خاموشی کے پنجرے میں قید ہو گئی، اس کی بے چین ماممتا محبت آمیز زوجیت میں تبدیل ہو گئی اور اب تو ان دونوں عناصر کے درمیان خط تقسیم کھینچنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس نے اپنی ساری توجہ مجھ پر مرکوز کر دی ہے، وہ میری دیکھ بھال اس طرح کر رہی ہے جیسے میں اس کا شوہر نہیں، بچہ ہوں، اس نے میرے ساتھ بیوی کی محبت سے زیادہ ماں کی شفقت کا سلوک شروع کر دیا ہے، ایسا لگتا ہے جیسے وہ کچھ کھو کر کچھ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور یہی بات کبھی کبھی مجھے تکلیف پہنچاتی ہے، ایک بچہ اس کے ہاتھوں میں سونپ دوں کئی بار یہ خیال بھی آیا کہ یتیم خانے سے ایک صحت مند خوبصورت بچہ لا کر....

ایک بار تو ڈرتے ڈرتے میں نے چھپرا سے یہ بات کہہ بھی دی لیکن ذرا بھی خفا ہوئے بغیر، اس طرح ہنس کر جیسے میرا مذاق اڑا رہی ہو، اس نے جواب دیا۔ "داد پرائے کبھی اپنے ہو سکتے ہیں؟ میری بات اور ہے، چاہے جو کچھ ہو لیکن میں عورت ہوں گود میں بچہ دیکھ کر مامتا بیدار ہوئے بغیر نہیں رہے گی لیکن آپ؟ خون کے رشتے کے بغیر آپ کی شفقت اس کی طرف کیسے ملتفت ہو گی؟" بات بھی صحیح تھی۔ اس کے بعد میں نے یہ خیال ترک کر دیا پھر اس طرح کا خیال کبھی نہیں آیا کبھی بھول کر بھی میں نے چھپرا کو اندرونی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا لیکن نہ جانے کیوں آج ایک بے سہارا

بچہ دیکھ کر اور اس کا چہرہ تکتی ہوئی چھپرا کی ان پیاسی نظروں سے ڈھلنے والی خاموش آواز سن کر.....

آفس جاتے وقت راستے میں بھی مجھے یہی خیال آرہا تھا کہ ایک بار لوٹ کر چھپرا سے کہہ دوں ۔ "پرماتما نے تیری خالی گود بھرنے کے لیے گھر بیٹھے ہی....." لیکن ہمت نہ ہوئی ۔ شاید چھپرا اسے اپنی توہین سمجھ لے شاید مامتا سے عاری عورت کی زندگی بے کار سمجھ کر.....

فطرتاً وہ جتنی شفیق ہے اتنی ہی غصہ ور بھی، اگر کوئی غلط معنی نکال لے تو کیا ہو گا؟ اسی تصور سے میں کانپ گیا۔ اس وقت بھی اسی خوف کے مارے میں نے دل ہی دل میں دعا کی ۔ "پولیس آکر اسے اٹھا لے گئی ہو تو اچھا ہے" ۔

آسمان سے اندھیرا اتر رہا ہے، کنارے کی ٹیکری کے نیچے والی سڑک سے ٹرک کے ہارن کی آواز آئی باہر نکل کر دیکھتا ہوں تو سب سامان لے کر ٹرک آپہنچا ہے، یہاں کھانے کا انتظام ممکن نہیں تھا اس لئے آفس کی طرف سے تیار ٹفن آچکے تھے، ساتھ ہی چائے پانی کا سامان بھی تھا۔ دو تین پٹرومیکس اور میرا بیگ بستر بھی آگیا تھا۔

ٹیکری پر آکر ایک شخص بیگ بستر رکھ گیا ۔ کچھ دیر بعد نیچے جا کر میں نے پٹرومیکس کی روشنی میں، جاری کام پر نظر ڈالی ۔ پھر انھی لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر وہی کھانا کھایا اور ایک نوکر سے کہا۔ "ایک آدھ گھنٹے بعد چائے بنا کر اوپر دے جانا" ۔

نیند آنے لگی لیکن رات بھر جاگنا ضروری تھا۔ پھر بھی کچھ دیر لیٹنے کے خیال سے میں نے بستر کھول لیا۔ بستر کھولتے ہی اوپر رکھی ہوئی نئی شال کا قرمزی رنگ آنکھیں چکا چوند کر گیا ۔ بیوی کو شوہر کی خدمت کا کتنا گہرا خیال ہے؟ گرمی میں شال کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن شاید بارش ہو جائے ٹھنڈک لگے اور.....

پچھلے برس بھی میں تقریباً انھی دنوں میں یہاں آیا تھا اور میرے علم کے بغیر ہی چھپرا نے بستر میں شال رکھ دی تھی، وہ شال جس کے کنارے پر چھپرا نے خود بیل بوٹے کی ہفت رنگی کشیدہ کاری کی تھی، اور وہ شال میں نے کھو دی تھی، پھر چھپرا نے

نئ شال خریدی اور اس کے کنارے پر بھی ویسی ہی کشیدہ کاری شروع کی مگر یہ کشیدہ کاری ادھوری تھی، صرف سرے پر تھوڑی سی جگہ میں کشیدہ کاری ہو پائی تھی مگر اس کے ساتوں رنگ میرے سامنے ہنس رہے تھے۔ گمبھیر تاریکی میں دھیرے دھیرے ایک کے بعد ایک سب کچھ نگاہوں میں تیر رہا تھا۔ تقریباً یہی دن تھے، ٹھیکے دار کے خلاف نانگول کے لوگوں کی شکایتی درخواست.... خود معائنہ کرنے کے لیے انٹونی صاحب کی ہدایت .... اور گمبھیر اندھیری رات، اچانک ہونے والی بارش.... اوپری حصے میں بارش ذرا پہلے شروع ہوئی ہو گی، اس لیے جو ندی تالاب میں موڑی گئ تھی، اس ندی میں اچانک سیلاب آگیا۔ کھدائی کے لیے آئے ہوئے مزدور کدال پھاوڑے لیے جان بچا کر بھاگے، صرف میں تنہا رہ گیا۔ میں اس طرف تھا۔ اسی ٹیکری پر اور اب اس پار نہیں جا سکتا تھا، یہ جگہ بھی محفوظ نہیں تھی، ہر لمحے پانی بڑھ رہا تھا اور ٹیکری کے دھنسنے یا ڈوب جانے کا قوی امکان تھا۔ اگر ٹیکری کے آس پاس پانی پھیل جائے تو کہیں بھی نہیں جایا جا سکتا بڑی دیر تک بھیگتے رہنے سے میں یہیں ٹھٹھر گیا تھا لیکن آخر ٹیکری چھوڑ کر کسی محفوظ مقام تک جانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

بارش کے ساتھ ساتھ سنسناتی ہوئی ٹھنڈی ہوا بھی اتنی ہی قاتل تھی، میں نے بستر سے شال نکال کر جسم پر لپیٹ لی۔ پھر بقیہ سامان یہیں چھوڑ کر ٹیکری کے دوسرے کنارے اتر پڑا۔ زوروں سے برستی ہوئی بارش میں بھیگتا، ہوا کی تیز سی سنسناہٹ میں تھر تھر کانپتا، میں گھٹنوں تک پانی میں آگے بڑھا۔ پیروں تلے، پانی میں ڈوبے کھیتوں کی پھولی ہوئی مٹی والی چکنی زمین تھی، اور اوپر گھنگھور آسمان۔ بیوہ کے لباس کی طرح سیاہ بادلوں کے گھٹا ٹوپ اجتماع نے سب کچھ تاریک کر دیا تھا۔ نانگول گاؤں اور راستہ کس طرف چھوٹ گیا ہے، اس کا مجھے خیال نہ تھا میں آنکھیں موندے، لڑکھڑاتے قدموں سے نہ جانے کب تک چلتا رہا، ایک آدھ گھنٹے بعد پیر پانی سے بہ مشکل باہر نکلے فضا میں بار بار چمکتی ہوئی بجلی کی لمحاتی مگر تیز روشنی میں، میں نے اتنا تو دیکھ لیا کہ زمین گیلی ہونے کے باوجود پانی کی مقدار زیادہ نہیں تھی، بارش کم ہو گئ تھی بے ہوش ہو

کر گر پڑنے میں ذرا بھی دیر نہیں تھی کہ پانی سے باہر آجانے کے باعث مجھ میں ہمت پیدا ہوئی۔

چہرے سے پانی پونچھ کر میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی، دور کچھ اونچائی پر ایک مدھم چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ بارش کی دھار چیر کر میری بے چین آنکھوں نے اس کی روشنی پکڑلی۔ زیادہ غور و فکر کیے بغیر میں مٹھیاں باندھ کر اس سمت میں دوڑا۔

مسطح زمین سے کچھ اونچائی پر وہ بھی ٹیکری جیسی ہی جگہ تھی، بلندی پر چڑھتے ہوئے سانس پھول گئی۔ ناک تک آجانے والے دم کے صرف باہر نکلنے کی دیر تھی کہ مجھے خیال آیا۔ میں کسی جھونپڑی کے دروازے کے پاس کھڑا ہوں، ایک لمحے بھی رکے بغیر میں نے دروازے پر زور زور سے مکیاں ماریں پترے کا دروازہ بج اٹھا۔ بجتا رہا اور اندر سے کسی کی چونکی ہوئی آواز آئی۔ کون ہے رے؟"

آواز چونکی ہوئی ہونے پر بھی تیز تھی، شعور کند کر دینے والی اس جسمانی پریشانی میں بھی مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ نازک آواز کسی عورت کی ہے، میں لگاتار مکیاں مارتے ہوئے بے چینی سے چیخا۔ "کھولو کھولو مسافر ہوں، بارش میں راستہ بھول کر پریشان ہو گیا ہوں"۔

دو چار لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ ٹمٹماتا ہوا چراغ ہاتھ میں لیے ایک دوشیزہ دروازے میں کھڑی تھی، اس کے خوبصورت چہرے پر تیرتے ہوئے اندیشے اس ٹمٹماتے چراغ کی روشنی میں بھی میری نظروں سے اوجھل نہ رہے، میں نے عجیب بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "گھبراؤ مت کچھ دیر کے لیے سہارا دے دو، ممنون ہوں گا۔ بارش رکتے ہی چلا جاؤں گا"۔

وہ ایک لمحے تک میری طرف تکتی رہی، پھر ذرا پیچھے ہٹی اور آہستہ سے کہنے لگی۔ "آئیے!"

میں مسرور قدموں سے اندر داخل ہو گیا اس نے دروازہ بند کر دیا۔ ٹوٹے ہوئے دروازے والی کھڑکی کے قریب والی کھونٹی پر اس نے چراغ ٹانگ دیا اور پھر کمر پر

ہاتھ رکھ کر میرا پانی سے شرابور جسم غور سے دیکھنے لگی۔ میں نے کھڑے کھڑے چاروں طرف نگاہ ڈالی، جھونپڑی پترے کی تھی اور کافی بڑی تھی، نیچے اینٹیں رکھ کر زمین پکی کی گئی تھی لیکن بیچ میں سیمنٹ ہونے کے باعث نمی اوپر آرہی تھی، میں نمی کی طرف دیکھے بغیر نیچے بیٹھ گیا۔ میری خستہ حالی نے اس کے چہرے کے اندیشے بکھیر دیے تھے، ملائم لہجے میں وہ پوچھنے لگی۔ "کہاں سے آرہے ہیں"؟

میں نے جسم کے اکڑے ہوئے اعضا ہلاتے ڈلاتے ہوئے ٹوٹتی آواز میں کہا۔ "ابھی کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ذرا تکان ختم ہونے دو"۔ اتنا ہی بولنے میں میری سانس پھول گئی۔

اس نے فکر مند لہجے میں کہا۔ "بہت بھیگ گئے ہیں نا۔ کپڑے تبدیل کریں گے؟"۔

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کھانستے ہوئے کہا۔ "کپڑے۔ لیکن کپڑے ہیں کہاں"

"ٹھہریے"۔ وہ سامنے والے کونے میں چلی گئی کونے میں ایک چارپائی پڑی تھی، نیچے سے ٹوٹا پھوٹا ٹرنک کھینچ کر اس نے ایک کپڑا باہر نکالا اور اسے میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی "گیلے کپڑے اتار کر اسے لپیٹ لیجیے"۔

بغیر بارڈر کی سفید موٹی ساڑی .... اس وقت وہ شال دوشالے سے بھی زیادہ قیمتی تھی، اٹھنے کی ہمت نہیں تھی، پھر بھی دیوار کا سہارا لے کر انتہائی کوشش کے بعد میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے ساڑی لنگی کی مانند جسم پر لپیٹ کر کپڑے اتار دیے۔ شال، قمیض، پینٹ، بنیان، سب کچھ۔ کپڑوں سے ٹپکتے ہوئے پانی سے زمین تر ہو گئی تھی، میں پھر سے نیچے بیٹھ رہا تھا کہ اس نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "ادھر آیئے۔ چارپائی پر بیٹھیے"۔

چارپائی پر میلا بستر بچھا ہوا تھا۔ میں اس پر گرنے ہی والا تھا کہ اس نے کہا۔ "ٹھہریے!" پھر اس نے صندوق میں سے ویسی ہی دوسری ساڑی نکال کر بستر پر بچھا دی، پھر پرسکون ہو کر کسی قدر خوشی کے لہجے میں بولی۔ "اب آرام سے لیٹیے!"

میں لیٹ گیا۔ اس نے پھر سے دروازہ کھولا اور دروازے میں کھڑی ہو کر تمام

کپڑے نچوڑ کر اندر بندھی ہوئی رسی پر ڈال دیئے، پھر گیلے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔ "یہ لیجئے آپ کی پتلون کی جیب سے یہ بٹوا نکلا ہے"۔

روپے کا پرس۔ لگ بھگ دو سو روپے تھے لیکن اس وقت اسے سنبھالنے کا ہوش کہاں تھا؟ میں نے سینے کے بل لیٹے لیٹے کہا۔ "اپنے پاس رکھو، جاتے وقت لے لوں گا"۔

پرس اس نے صندوق میں رکھ دیا اور صندوق چارپائی کے نیچے کھسکا دی، کچھ دیر بعد سر اٹھا کر دیکھتا ہوں تو وہ گیلی زمین پر ٹاٹ بچھا کر چپ چاپ بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھی، میں نے منہ پھیر لیا چڑھتی ہوئی سانس کے ساتھ پیدا ہونے والی کھانسی اور بہتی ہوئی ناک ... اچانک وہ بولی۔ "معلوم ہوتا ہے آپ کو زکام ہو گیا ہے"۔

"ہاں ... !"

اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے بال چھوتے ہوئے کہا۔ "سر تو اب تک گیلا ہے۔ زکام نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔ ٹھیرئیے پونچھ دوں!"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں، اس نے کھونٹی سے گمچھا اتار کر میرا سر پونچھنا شروع کر دیا۔ پھر سوکھے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے کہا۔ "ابھی سوکھ جائیں گے"۔

رات کی تنہائی میں اجنبی شخص کو دیکھ کر پیدا ہونے والے اندیشے، مانوس ہو جانے پر ختم ہو گئے۔ وہ اپنوں کی طرح باتیں کرنے لگی۔ میں پیر سکوڑے ہوئے سینے کے بل لیٹا تھا۔ جسم میں پیوست ہو جانے والی ٹھنڈک کی وجہ سے دانت کٹکٹا رہے تھے، اس نے پوچھا۔ "بہت سردی لگ رہی ہے؟"

میں نے کہا۔ "پورے ایک گھنٹے تک بارش میں بھیگا ہوں اس لیے سردی لگ گئی ہے"۔

اس نے چارپائی کے قریب آکر کہا۔ "ذرا کھسکیے تو!" اور بستر کے نیچے رکھا ہوا کمبل نکال کر اس نے مجھے اڑھا دیا۔

بارش کم ہو جانے کے بعد دوبارہ جوش میں آگئی تھی، ہر لمحے خوف ناک گرج، طوفانی ہوا اور بجلی کی کڑک .... ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے بجلی کی زبان کی لپلپاہٹ اندر داخل ہو جاتی اور اس کا چھوٹا سا چہرہ چمک جاتا۔ نومولود بچے کا سا معصوم چہرہ ۔ وہ اتنا بھولا لگتا کہ پیار کے جذبات بیدار ہو جاتے ۔ آہستہ آہستہ پیدا ہونے والی قربت کا احساس دلانے کے لیے میں نے اسے "تو" سے مخاطب کر پوچھا" ۔ تو یوں ہی بیٹھی رہے گی؟ سونا نہیں ہے؟"

اس نے گو مگو کے عالم میں آس پاس نظر دوڑائی جیسے پوچھ رہی ہو " کیسے سوؤں"؟ سب گیلا تھا اور شاید اس کے پاس اوڑھنے بچھانے کے لیے اور کچھ نہیں تھا۔ فوراً موضوع بدلتے ہوئے اس نے کہا۔ "آپ کا زکام کیسا ہے. کیسے تو رائی کا تیل مل دوں؟"

"رائی کا تیل؟"

"ہاں، گھر میں رکھنا پڑتا ہے. پتاجی کی طبیعت اچھی نہیں رہتی ہے! انھیں بھی اکثر زکام ہو جاتا ہے ۔

میں نے چونک کر پوچھا۔ پتاجی کہاں ہیں؟

کام پر جاتے ہیں، ناگول کے پاس تالاب کھودا جا رہا ہے نا! اب تو جسم کام نہیں کرتا پھر بھی کام تو کرنا ہی پڑتا ہے!"

"تالاب؟ تالاب میں تو پانی بھرتے ہی سب آدمی اس پار بھاگ گئے" ۔

"تب تو پتاجی بھی ان کے ساتھ ہوں گے، اب دو دنوں تک نہیں آسکیں گے، ندی میں سیلاب آتا ہے تو بارش رکنے کے دو روز بعد تک ندی راستہ نہیں دیتی ۔" وہ ذرا بھی متردد ہوئے بغیر بالکل فطری انداز میں بول رہی تھی اس نے پوچھا۔ "آپ بھی وہیں سے آرہے ہیں؟"

"ہاں میں اس طرف کے کنارے پر رہ گیا تھا۔ اس لیے اسی طرف بھاگا" ۔ اتنا کہہ کر میں نے اپنے بارے میں تمام باتیں اسے بتا دیں ۔

اس نے ہنس کر آنکھیں پھیلاتے ہوئے کچھ خوش ہو کر کہا۔" تب تو آپ سرکاری صاحب ہیں نا؟ یہ جان کر تو پتاجی بھی خوش ہوں گے کہ آپ یہاں آئے تھے۔"

میرا درجہ جاننے کے بعد اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ فوراً اُٹھ کر تیل کی شیشی لے آئی۔ رائی کا تیل، اور کمبل ہٹا کر پوچھے بغیر میرے جسم پر ملنے لگی میرے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ کسان کی لڑکی ہونے کے باوجود اس کے ہاتھوں میں کتنی ملائمت تھی، اس کا ہلکا ملائم ہاتھ آہستہ آہستہ جسم پر چل رہا تھا۔ پیٹھ پر، سینے پر، گردن پر ایسا لگتا تھا جیسے آسمان میں لہراتی بجلی زمین پر اتر کر میرے جسم میں سما گئی ہے، اور ہر عضو میں ارتعاش پیدا کر کے ذرے ذرے کو ہلا رہی ہے۔ وہ چارپائی کی پٹی پر کچھ تکلیف سے بیٹھی تھی۔ میں اس خیال سے ذرا پیچھے کھسک گیا کہ وہ آرام سے بیٹھ سکے، وہ پٹی سے نیچے کھسک آئی موٹے کپڑے میں ڈھکی اس کی صحت مند ران سے میرا ہاتھ دب رہا تھا اور اسے ہٹا لینے کی خواہش کی بہ نسبت، اسے دبا رہنے دینے کی خواہش زیادہ طاقت ور ہوتی جا رہی تھی، وہ بڑی دیر تک سر جھکائے مالش کرتی رہی، میری کھانسی رک گئی تھی، اس نے ہنستے ہوئے کہا۔" دیکھا نا! رائی کا تیل بڑا اکسیر ہے۔ آپ کا زکام کیسا ہلکا پڑ گیا؟" واقعی یہ رائی کے تیل ہی کا کرشمہ تھا یا اس کے کومل ہاتھوں کا؟ یا پھر لمس کے سبب تیز سانسوں سے پیدا ہونے والی گرمی کا؟

میں نے آنکھیں ملانے کی ہمت ہار کر آنکھیں موند لیں، اس نے ہاتھ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔" نیند آ رہی ہے؟"

باہر طوفان کے شور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔" اس میں نیند کیسے آ سکتی ہے؟" اور پھر رک کر بولا۔" آج سارا دن پیٹ میں کچھ نہیں پڑا۔ خالی پیٹ کی وجہ سے بے چینی ہو رہی ہے"۔

ایسا لگا جیسے کھانے کے بارے میں پوچھنا بھول جانے کے سبب وہ یکایک شرما گئی ہو، دوسرے ہی لمحے بے خیالی میں پوچھ بیٹھی۔" چائے پئیں گے؟"

"اس وقت چائے؟"

"ہاں..... پتاجی اکثر جب دیر سے آتے ہیں تو چائے مانگتے ہیں اس لیے دودھ رکھنا پڑتا ہے، تاکہ کہیں تو چائے بنا دوں، دوپہر کے وقت کی باجرے کی ٹھنڈی روٹی پڑی ہے، اسے بھی گرم کر دوں گی، چائے اور روٹی پسند آئے گی؟"

ایک اجنبی کے لئے اس کی اتنی پرخلوص خدمات سے متاثر ہو کر میں غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں چائے بنوانے سے انکار کروں گا تو وہ ناراض ہو جائے گی، ذرا ٹھیرے ہوئے لہجے میں، میں نے کہا۔ "سب پسند آئے گا"۔

یہ سنتے ہی وہ انتہائی خوشی سے کودتی ہوئی سامنے والے کونے میں پہنچ گئی اور جلدی سے انگیٹھی جلا کر چائے بنا ڈالی۔

وہ دس منٹ کے اندر ہی کانسی کی رکابی اور پیالے میں چائے روٹی دے گئی۔ شاہی طعام اور مغلیہ کھانے کے بارے میں تو بہت کچھ سنا ہے لیکن ایسی شیرینی تو شاید اس میں بھی نہ ہوتی ہو گی، ذائقے سے معلوم ہوتا تھا کہ چائے میں سونٹھ ڈالا گیا ہے وہ زکام ٹھیک کرنے کی تمام کوششیں کر رہی تھی، میں کھاپی کر لیٹا۔ وہ پھر اسی طرح بیٹھ گئی۔ میں نے کچھ سوچنے کے بعد ہمت کر کے کہا۔ "تو چارپائی پر بیٹھ جا نیچے ہر طرف نمی ہے تجھے بھی زکام ہو جائے گا"۔

اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ہم لوگوں کو اس طرح جلدی زکام نہیں ہوتا"۔

میں نے کہا۔ "نہیں، میں چارپائی پر لیٹوں اور تو گیلی زمین پر بیٹھی رہے، یہ مجھے اچھا نہیں لگتا"۔

شاید مجھے خوش کرنے کے لیے وہ میرے پیروں کے پاس بیٹھ گئی دونوں میں سے کسی کو نیند نہیں آرہی تھی، اس کا سبب اسے بھی معلوم تھا۔ کچھ بات کرنے کی غرض سے میں نے پوچھا۔ "یہاں ویرانے میں جھونپڑی بنا کر کیوں رہتی ہو؟"

"یہاں ہمارا کھیت ہے، دیکھ بھال تو کرنی ہی چاہیے نا پہلے چار کھیت تھے لیکن

ماں کے مرجانے کے بعد پتاجی سے اکیلے سنبھالتے نہ بنے۔ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی پھر پتاجی بیمار پڑے، تمام کھیت بیچ دیے یہی ایک بچا ہے....."

مجھے اس کی باتوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، اس کا بات کرنے کا انداز بھی بے حد پیارا تھا۔ آواز میں مجبوری کا کوئی احساس نہیں تھا۔ پھر بھی میرے دل میں آپ ہی آپ ہمدردی پیدا ہونے لگی، وہ کیا کہہ رہی ہے؟ صرف ایک ہی کھیت بچا ہے، اس میں کیسے پورا پڑ سکتا ہے؟ اسی لیے تو بوڑھے باپ کو بیمار ہونے کے باوجود مزدوری کرنے کے لیے جانا پڑتا ہے، اور ندی میں سیلاب آجانے کے باعث وہ دو دنوں تک گھر نہیں آسکے گا، ذرا رک کر میں نے پوچھا۔"اس طرح تجھے اکیلی چھوڑ کر جانے سے پتاجی کو بڑی فکر ہوتی ہو گی؟"

"نہیں، فکر کی کیا بات ہے؟ یہاں کھیتوں کی کیاریوں پر تو ایسی کئی جھونپڑیاں ہیں مگر بارش میں آپ کو دکھائی نہ دی ہوں گی"۔

وہ ہنس پڑی، وہ اکثر یوں ہی بے وجہ ہنس پڑتی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے اس بھیگی بھیگی مست ہوا میں، اس گھن گرج میں، وہ نہیں بلکہ ایک جمی ہوی بجلی ہنس رہی ہے میں بھی کمبل میں لپٹا ہوا جسم پھیلاتے ہوئے ہنس پڑا۔ پھر بولا۔" کچھ دیر آرام کر لوں، اجالا ہوتے ہی چلا جاؤں گا"۔

"واہ! ابھی کیسے جائیں گے؟ دیکھیے تو بارش کو اب بھی چین کہاں ہے؟ ندی کیسے پار کریں گے؟"

بات تو ٹھیک تھی۔ میں سمجھتا تھا۔ پھر بھی میں نے کہا۔" لیکن تجھے اس طرح بیکار کیوں تکلیف دیتا رہوں؟"

اس کی آنکھوں میں حیرت کی چمک نمودار ہوئی "تکلیف! میرے لیے تو اچھا ہوا ورنہ پتاجی کے آنے تک تنہا رہنا پڑتا میں تو کہتی ہوں کہ پتاجی کے آنے تک یہیں رہ جائیے۔ یہ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوں گے کہ صاحب آئے ہیں"۔

میں نے کہا۔"ہاں! وہ تو خوش ہوں گے لیکن تب تک تیری کیا حالت ہو جائے

گی؟میں اس طرح لیٹا رہوں اور تو بیٹھی بیٹھی تپسیا کرتی رہے یہی نا؟ بھلا ایسے میں، میں کیسے آرام سے سو سکتا ہوں؟" وہ خاموش ہو گئی۔ چراغ کی بالکل مدھم روشنی میں بھی مجھے اس کی آنکھوں کی چمک نظر آرہی تھی، جواب دینے میں اسے دشواری ہو رہی تھی، کچھ دیر بعد وہ سر جھکا کر بولی۔ "پتاجی بھی اسی طرح کہتے ہیں، بارش ہونے پر نیچے زمین پر سونے ہی نہیں دیتے۔ہاتھ پکڑ کر جبراً چارپائی پر سلا دیتے ہیں"۔

چونک کر میں نے پوچھا۔ "پھر بابا کہاں سوتے ہیں؟"

"ساتھ ہی تو ہم باپ بیٹی ساتھ ہی سو جاتے ہیں۔جب چھوٹی تھی، اسی وقت سے مجھے پتاجی کے گلے سے لگ کر سونے کی عادت....."

غیر شعوری طور پر میرا ہاتھ آگے بڑھ گیا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر کانپتی آواز میں بولا۔ "آ۔ سو جا۔!" وہ چونک پڑی اور اس نے میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ میں ایک پل کے لیے فطری طور پر مبہوت ہو گیا لیکن فوراً انتہائی ہمت سے کہا۔ "تو پھر میں چارپائی پر نہیں سوؤں گا"۔

"نہیں نہیں، دیکھیے ایسا نہ کیجئے گا"۔

میں نے تیز آواز میں کہا۔ "میرے ساتھ سونے میں اگر شرم آتی ہے تو پھر مجھے تیرے لیے چارپائی خالی کر دینی چاہیے نا؟"

وہ اچانک ہنس پڑی، جیسے پہلے ہنسی تھی، بھرپور اور خالص ہنسی، وہ اپنا جھکا ہوا سر پل دو پل انگلی کے ناخن سے کریدتی رہی پھر قریب آئی۔ میں نے جسم کھسکا لیا اور ہچکچاہٹ دور کرنے کے لیے خود ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پہلو میں لٹا لیا۔ اس نے آنکھیں موند لیں، وہ واقعی بہت شرما رہی تھی! وہ بے قصور تھی۔ پھر بھی اسے شرمانا آتا تھا.... وہ حیا کا مفہوم سمجھتی تھی۔

میں نے انتہائی نرم لہجے میں پوچھا۔ "سردی لگ رہی ہے؟"

اس نے ہتھیلی میں دبے منہ سے، دبی آواز میں جواب دیا۔ "ہاں!"

میں نے اپنا جسم کمبل میں لپیٹ کر اس کا بدن لپیٹ لیا۔ اس کے سینے کی

دھڑکن مجھے صاف سنائی دے رہی تھی اور اس کی سانسوں سے پیدا ہونے والے ساتوں سر بارش کی رم جھم کے ساتھ مل کر ایک عجیب نغمگی پیدا کر رہے تھے۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا.... اور میں اس لطیف کیفیت میں آہستہ آہستہ ڈوبتا گیا۔ میں سب کچھ بھول چکا تھا۔ گونجتے کڑاکے میں لرزتی جھونپڑی کا دیا۔ سائیں سائیں کرتی ہوا میں تھرتھراتی روشنی۔ شاید چراغ میں تیل ختم ہو رہا تھا۔ ایک تیز چمک کے بعد روشنی بجھ گئی۔ طویل گرج کے ساتھ بجلی کوندی، خوف کے مارے وہ میرا اگلا باہوں میں کستی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔

رات گئے بارش رک گئی۔ طوفان چلا گیا تھا اور سویرا ہونے پر سہانی دھوپ نکل آئی تھی، وہ بہت متاسف تھی۔ مجھے چارپائی پر سویا چھوڑ کر اس نے جلدی جلدی گرہستی کے کام نمٹانے شروع کیے، دوپہر ہوتے ہوتے میرے بھیگے کپڑے سوکھ گئے تھے وہ انھیں تہہ کر کے مجھے دیتے ہوئے بولی۔ "لیجیے پہن لیجیے" پھر شال تہہ کرتے ہوئے بیل بوٹے والی ست رنگی کشیدہ کاری پر تحسین آمیز نگاہ ڈال کر اس نے رسیلی آواز میں کہا۔ "کیسی خوب صورت کشیدہ کاری ہے، ہے نا؟"

میں نے اچانک کہہ دیا۔ "تجھے پسند ہے؟ ہے تو رکھ لے"۔

واقعی وہ اسے پسند آگئی تھی، اور صرف شال ہی نہیں اگلے روز وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے میں نے پرس بھی اس کے سامنے کر دیا وہ سر ہلا کر بولی۔ "نہیں!"

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ دان نہیں ہے، تو جانتی ہے۔ اگر تو نے مجھے سہارا نہ دیا ہوتا تو میں اس وقت زندہ نہ ہوتا۔ میں زندگی عطا کرنے کے بدلے میں تجھے یہ معمولی سا تحفہ دے رہا ہوں"۔

وہ پھر بھی نہ مانی۔ اس کی سیاہ اداس آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ میں نے بہت مشکلوں سے سمجھا بجھا کر آخر پرس سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کی کھلی ہتھیلی میں ایک نیلا رنگین کاغذ یوں پھڑپھڑا اٹھا جیسے....

اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ صرف ہاتھ ہی نہیں، پورا بند، پلکوں کے جھولے میں

جھولتے ہوئے دو آنسو بھی، اس وقت جدائی کی اس گھڑی میں وہ خود بھی ایک آنسو پری جیسی لگ رہی تھی۔ بھیگی، سیال، چمکتی، جھولتی، کانپتی لیکن اب وہ ہنس نہیں رہی تھی، وہ بولی، معصوم، کھلکھلاہٹ سے بھری ہنسی بالکل اوجھل ہو گئی تھی، اس کی ہتھیلی پر نوٹ رکھ کر میں نے خود اس کی مٹھی بند کر دی، اور اپنے دونوں ہاتھوں میں اسے دبا لیا پھر میں نے جذبات میں اسے کھینچ لیا۔ ڈور کے ساتھ کھنچ آنے والی مچھلی کی طرح وہ کھنچ آئی۔ اس کا گل مہر کے پھول جیسا چہرہ نہ جانے کب تک میری ہتھیلیوں میں دبا رہا گلاب کی ادھ کھلی کلی کے مانند اس کے ادھ کھلے سرخ ہونٹوں پر میرے ہونٹ جمے رہے اس کی گھٹتی بڑھتی معطر سانسوں کا آبِ حیات نہ جانے کب تک پیتا رہا۔

چڑھتی دھوپ میں کرنوں کی باہوں سے پرچھائیاں کھسک رہی تھیں، وہ آہستہ آہستہ میرے بازوؤں سے الگ ہو رہی تھی، بہت کچھ الگ ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے بہت کچھ کہنا باقی رہ گیا ہے لیکن اب وقت نہیں تھا۔ وہ رک گئی اور میں دروازہ پار کر گیا۔ الوداع کہتے ہوئے وہ بھرائی ہوئی آواز میں پوچھنے لگی۔ "پھر آئیں گے؟"

میں نے کہاں۔ "ہاں! ڈیم بن رہا ہے اس لیے اکثر و بیشتر اس طرف آنا ہوتا رہے گا۔ اب آؤں گا تو تجھ سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا"۔

اس کی معصوم آنکھوں میں عقیدت کی روشنی جگمگا رہی تھی، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دن کی روشنی میں اس روشنی کی لو برداشت کرنے کی صلاحیت مجھ میں نہیں ہے، وہ دروازے پر ہی کھڑی رہی۔ اور میں چلا آیا۔

گھر آیا تو چھپرا کی بے چینی کی انتہا نہ تھی، طوفان اور ندی کے سیلاب کی خبر اسے مل چکی تھی۔ مجھے بخیر دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا پھر میرا سامان ٹھیک کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "اس میں آپ کی شال کیوں دکھائی نہیں دیتی؟"

کیسے جواب دوں؟ کیا جواب دوں؟ میں نے کہا۔ "دوڑ بھاگ میں شال کہیں گم ہو گئی"۔

اس نے کہا۔ "اچھا ہوا کھو گئی، جان بچی تو لاکھوں پائے، نئی خرید لیں گے"۔

اور اگلے جاڑے میں اس نے میرے لئے نئی شال خرید لی اور جہاں پہلی شال چھوڑ آیا تھا وہاں جانا ممکن ہی نہ ہو سکا۔

○○○

یکایک میرے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ چونک کر دیکھا تو نوکر آرہا تھا۔

"صاحب۔ چائے!"

چائے کا گلاس ہاتھ میں لے کر میں نے پوچھا۔ "بند پر کام کرنے والے مزدوروں میں کوئی کسان، ہو تو اسے میرے پاس بھیج دو"۔

کچھ دیر بعد ایک کسان آیا۔ میں نے پوچھا۔ "گزشتہ سال یہاں بند پر ایک کسان کام کرتا تھا۔ نام تو یاد نہیں ہے لیکن وہ بوڑھا اور بیمار تھا۔ اس پار کے کھیتوں میں کہیں اس کی جھونپڑی تھی"۔ اور کچھ ٹھیر کر میں نے کہا۔ "ایک جوان لڑکی بھی۔"

"کس کی؟ لچھمن کی بات کر رہے ہیں نا صاحب! وہ تو مر گیا۔ چھ مہینے ہو گئے ہوں گے۔ کھیت بیچ کر لڑکی بھی کہیں چلی گئی ہے معلوم نہیں کہاں گئی"۔

آگے اور کچھ پوچھنے کی بات نہیں بچی تھی، بارش آتے آتے رک گئی تھی، میں کسی پریشانی کے بغیر دو دنوں میں ابتدائی رپورٹ تیار کر کے لوٹ آیا لیکن گھر کے رنگ ڈھنگ دیکھتے ہی آنکھیں حیرت زدہ رہ گئیں، دیوان خانے میں ایک چھوٹا سا پالنا جھول رہا تھا اور چھپرا کھڑی جھولا جھلا رہی تھی۔ "یہ کیا ہے چھپرا؟"

"کیا؟"

"صحن میں بچہ پڑا ہوا تھا نا! پھر پولیس آئی لیکن اس سلسلے میں الجھن پیدا ہوئی کہ بچے کو کہاں رکھا جائے"۔

"اس لیے تو نے مانگ لیا۔ یہی نا؟"

"ویسے تو نہ مانگا ہوتا لیکن"۔ وہ ذرا رک گئی۔ پھر اس طرف کی دیوار کی جانب

نظر کر کے بولی۔ "لیکن پولیس نے چادر ہٹائی اور چادر کے نیچے سے یہ شال نکل پڑی"۔ اس نے کھونٹی سے کشیدہ کاری والی شال اتار کر میری طرف پھینکتے ہوئے اپنی بات پوری کی "۔جو شال آپ نے کھو دی تھی"۔

ادرس
(انڈونیشی)

جکارتہ جانے والی گاڑی

یوں تو انڈونیشیا کی سرزمین سردی کے لئے مشہور ہے۔ لیکن کھڑکی کے سامنے لائن لگا کھڑے مسافر گرمی سے بے حال ہو رہے تھے۔ ان کی پشت، گردن اور کپڑے پسینے میں شرابور تھے۔ نوجوان برابر کھانسے اور تھوکے جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے کھڑے شخص نے پوچھا۔ "یہاں تو دھول اور گرد بھی نہیں ہے پھر کھانس کیوں رہے ہو"۔

"مجھے تو صاف سے صاف کمرے میں بھی کھانسی آتی ہے" نوجوان پھر کھانسا اور بولا۔ "میں پت جیت سے ابھی یا ہوں اور جکارتہ جا رہا ہوں"۔

اگلے سرے پر چیتھڑوں میں لپٹا ایک شخص کھڑکی میں اپنا خارش زدہ ہاتھ گھسائے زور زور سے کہہ رہا تھا۔ "ایک ٹکٹ فورتھ کلاس جکارتہ.... ایک فورتھ کلاس جکارتہ"۔

ٹکٹ بابو سے غراتے ہوئے کہا۔ "کیوں شور مچاتے ہو؟ چپ نہیں رہ سکتے تو چلے جاؤ"۔

"مجھے ٹکٹ مانگتے مانگتے آدھا گھنٹہ تو ہو گیا ہے کب تک چپ کھڑا رہوں؟" اس آدمی نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ پھر اس نے ٹکٹ بابو کے پیچھے کھڑے ہوئے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا جو ریلوے کا ہی آدمی تھا اور بلیک میں بیچنے کے لئے ٹکٹ لے رہا تھا۔

ٹکٹ بابو اس کی اس حرکت پر اور چراغ پا ہو گیا اور چیخ کر بولا۔" تم اپنا کام دیکھو۔ اگر جلدی ٹکٹ لینا ہے تو اسی سے لے لو۔ آٹھ آنے ہی تو زیادہ لگیں گے"۔

یہ سن کر وہ آدمی خاموش ہو گیا۔ پھر سر کو ہلاتے ہوئے زیر لب بولا۔" آج کل ہر آدمی جیب بھرنے پر لگا ہوا ہے۔ کوئی دیکھنے سننے والا نہیں ہے"۔

اتنے میں قطار کو چیرتا ہوا ایک چینی شخص کھڑکی کے پاس آیا۔ کھڑکی کے پاس آکر وہ اپنے قیمتی رومال سے پسینہ پونچھنے لگا۔ اسے دیکھ کر خاموش کھڑے ہوئے انڈونیشی شخص نے کہا۔" مہربانی فرما کر آپ لائن میں آئیں"۔

چینی نے کہا۔" بک بک نہ کرو جانتے ہو میں کون ہوں؟ میرے پاس جاپانی حکام کا دیا ہوا پاس ہے.... ایک سیکنڈ کلاس جکارتہ"۔

" سیکنڈ کلاس تو صرف جاپانیوں کے لئے ہے جناب" ٹکٹ بابو نے جواب دیا۔

چینی پہلے تو ہنسا پھر اپنے ہاتھ میں دبے پانچ کے نوٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔" میرا پاس یہ ہا۔ جکارتہ کا کرایہ ڈھائی روپے سے زیادہ نہیں ہے... باقی پیسے.... ٹکٹ بابو نے نوٹ کی طرف دیکھا پھر آواز میں چاشنی پیدا کرتے ہوئے بولا۔" یہ لیجئے سیکنڈ کلاس جکارتہ"۔

ریل گاڑی سک بھومی اسٹیشن سے چل پڑی۔ تھرڈ اور فورتھ کلاس کے ڈبے اس طرح بھر گئے جیسے ان میں بوریاں چن دی گئی ہوں۔ ٹکٹ چیکر راستہ بناتا ہوا دروازے پر کھڑے لوگوں کے پاس جا پہنچا۔" ٹکٹ ٹکٹ"۔ ہر ایک آدمی نے ٹکٹ کے بدلے نوٹ نکال لیا ٹکٹ چیکر نے ناراض ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا" جب تم لوگوں کے پاس ٹکٹ نہیں ہے تو بیٹھ کیسے گئے؟" اور وہ لوگوں کے ہاتھوں سے نوٹ لے لے کہ اپنی جیب میں ٹھونسنے لگا۔ جاتے ہوئے اس نے بڑے پیار بھرے انداز میں کہا۔" آئندہ سے آپ لوگ ٹکٹ لے کر چلا کریں"۔

گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی۔ گاڑی کے رکتے ہی بہت سارے نوجوان ڈبوں میں گھس گئے وہ لوگ کمر تک ننگے تھے مگر ان کے سروں پر ٹوپیاں تھیں جس سے

یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہوم گارڈ پولیس کے آدمی ہیں۔ یہ نوجوان مسافروں کے سامان کی تلاشی لینے لگے جس کے پاس بھی چاول ملتا وہ اس سے چاول لے کر نیچے رکھ دیتے۔ دیکھتے دیکھتے پلیٹ فارم پر چاول کا ڈھیر لگ گیا جن لوگوں نے چاول کو چھپانے یا اسے ان لوگوں کے حوالے کرنے میں پس و پیش سے کام لیا۔ ان لوگوں کی خوب پٹائی ہوئی۔

ایک سیٹ پر چاول کا ایک تھیلا رکھا ہوا تھا۔ تھیلے کو اٹھاتے ہوئے ایک پولیس والے نے پوچھا۔" یہ کس کا ہے؟"

" یہ میرا ہے۔ کیا تمہیں چاہئے؟" ۔عام پولیس کے ایک سپاہی نے بارعب آواز میں کہا۔

" ہوم گارڈ پولیس کے سپاہی نے فوراً اسے ایک سیلوٹ مارا اور گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

" معاف کیجئے صاحب مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں نے سمجھا کہ یہ کسی اور کا ہے" ۔

اپنا کام ختم کر کے ہوم گارڈ پولیس کے سپاہی گاڑی سے نیچے اتر گئے۔ پلیٹ فارم پر پڑے چاول کے ڈھیر دیکھتے ہوئے ہوم گارڈ کے ایک سپاہی نے دوسرے سپاہی سے سرگوشیوں میں کہا۔" حوالدار تو ابھی ابھی شہر گیا ہے۔ دوپہر سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ ان چاولوں کو پانچ حصوں میں تقسیم کر لو اور تھوڑا سا چاول یہیں رہنے دو۔ حوالدار آئے گا تو اس سے کہہ دیں گے کہ آج دن بھر میں یہی چاول پکڑا گیا ہے" ۔

گاڑی چلنے ہی لگی تھی کہ ڈبے میں ایک عرب شخص داخل ہوا اس کے پیچھے پیچھے ایک اور نوجوان چڑھا جس کی قمیض تار تار ہو رہی تھی۔ وہ ایک بیساکھی کا سہارا لئے ہوئے تھا کیونکہ اس کی داہنی ٹانگ کٹی ہوئی تھی۔ ڈبے میں جگہ نہیں تھی۔ اس لئے وہ بیچارہ دروازے پر لگے ڈنڈے کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ عرب شخص نے اس سے دریافت کیا۔

" تمہیں کہاں جانا ہے۔ اس طرح تم دروازے پر کب تک لٹکے رہو گے؟"

اس نوجوان نے نرمی سے کہا۔" جکارتہ جانا ہے صاحب۔ کیا بتائیں صاحب

یہاں تو کوئی بھی ایسا آدمی نہیں رہ گیا جو بھیک دے سکے اسی لئے جکارتہ جا رہا ہوں اگلے اسٹیشن پر کچھ لوگ تو اتریں گے ہی۔ تب میں اندر آجاؤں گا"۔

گاڑی چلنے لگی تھی۔ ایک پولیس والا فورتھ کلاس میں بیٹھی ایک کبڑی لڑکی کو بہت دیر سے گھور رہا تھا اس نے لڑکی سے بات چیت کا آغاز کرتے ہوئے کہا.... "معاف کیجئے گا۔ کیا آپ یہ بتائیں گی کہ آپ کی عمر کیا ہے"؟

لڑکی نے اس کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا "بتیس سال۔ کیوں کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں کچھ نہیں۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کی کمر اتنی سی عمر میں کیسے جھک گئی"۔ یہ کہہ کر وہ اس کی پشت اور کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔ "کتنی خوبصورت ہے آپ کی کمر"۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد اس نے پھر کہا.... "آپ جیسی حسین لڑکی کی پشت پر بندھا یہ چاول.... یہ کوبڑ اچھا نہیں لگتا۔ آپ اطمینان سے یہ چاول میرے تھیلے میں ڈال دیجئے۔ جکارتہ پہنچ کر میں آپ کا چاول آپ کو لوٹا دوں گا مجھ سے ڈریئے نہیں میں آپ کی پوری مدد کروں گا"۔ یہ کہہ کر سپاہی ہنس پڑا۔ لڑکی بھی پول کھل جانے کی وجہ سے شرمندہ سی ہو گئی۔ اس نے اپنے ڈھیلے ڈھالے چغے میں ہاتھ ڈال کر اپنی پیٹھ سے چاول کھول کر سپاہی کے تھیلے میں انڈیلے دیئے۔

"ریل تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ یکایک ایسا دھچکا لگا کہ دروازے کے پاس کھڑے لنگڑے نوجوان کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ گیا اور وہ نیچے جا گرا۔ کسی نے گاڑی روکنے کے لئے زنجیر کھینچ دی۔ گاڑی رک گئی۔ لوگ باگ اس نوجوان کو اٹھانے کے لئے پیچھے کی طرف دوڑے لیکن اس وقت تک وہ نوجوان مر چکا تھا اس کی لاش کو وہیں چھوڑ دیا گیا۔ گارڈ نے کچھ لکھا اور پھر گاڑی چل دی۔ عرب شخص جس نے اس نوجوان کو گرتے ہوئے دیکھا تھا گھبرانے لگا۔

اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ گارڈ جلدی سے اتر کہ قریب کے چھوٹے سے دفتر میں گیا۔ جہاں ایک آدمی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ گارڈ نے اس آدمی سے پوچھا۔ "کہو کیا حال

چال ہے کریم ۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

"جی ہاں خوش قسمتی سے آپ کا وہ سامان بک گیا صاحب لیکن قیمت صرف ڈیڑھ سو روپے ملی ۔ اب تو مجھے میرا کمیشن مل جائے گا نا؟"

"کمیشن کہاں سے مل جائے گا؟ یہ تو تمہاری غلطی ہے کہ تم نے کم قیمت پر سامان بیچ دیا پھر بھی تم یہ دس روپے رکھ لو"۔

کریم نے روپے لیتے ہوئے کہا۔"جکارتہ کے لئے کوئی اور سامان بچا ہے؟"

ہاں! کچھ دوائیاں ہیں"۔

"ارے صاحب! دوائیوں کی بہت مانگ ہے جکارتہ میں تو نوجوان طبقہ اس کا بری طرح شکار ہے ۔ مگر اسے اور مہنگا مت کر دیجئے گا صاحب"۔

کچھ دیر بعد ریل گاڑی جکارتہ کے اسٹیشن پر کھڑی تھی ۔ لوگ جلد سے جلد اسٹیشن سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ پلیٹ فارم سے باہر جانے والے دروازے کے پاس نقلی کوبڑ والی وہ لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کسی نے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا ۔"چاول ۔ وہ پولیس والا میرے چاول لے کر غائب ہو گیا"۔

وہ پھر زار و قطار رونے لگی ۔

درگا پرساد سریشٹ

(نیپالی)

ہچکولے

سبا باجے کو جانے کیوں عجیب عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہندوستانی ریلوے اسٹیشن سے اتر کر وہ سرحد پار اپنے گاؤں کی طرف چلے۔ چھوٹا سا تانگہ ٹنگ ٹنگ کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ کچی سڑک کے گڈھوں میں پڑ کر تانگے کا پہیہ اونچا نیچا ہو جاتا تو سبا باجے کا تھل تھل جسم ہچکولے کھانے لگتا۔

"بہت دنوں بعد آئے مالک"۔ مسلمان تانگے والا سبا باجے سے باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ انھیں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ سبا باجے جب بچے تھے اسی وقت سے تانگے والا انہیں اسٹیشن سے گاؤں اور گاؤں سے اسٹیشن پہنچایا کرتا تھا۔ اس زمانے میں سبا باجے پڑھنے کے لئے بنارس جاتے تھے۔ ایک بار چھٹی میں واپس آتے ہوئے انہوں نے اس کے لئے ایک قمیص لادی تھی۔ قمیص لے کر وہ بہت خوش ہوا تھا۔ "عید کے دن پہنوں گا"۔ اس نے کہا تھا اور قمیص سنبھال کر رکھ دی تھی۔

"چھٹی میں آئے ہیں کیا مالک؟" تانگے والے نے پوچھا۔

"ہوں"۔ سبا باجے اس سے زیادہ کچھ نہیں بولے۔ وہ کچی سڑک کے دونوں طرف آنکھیں گھما گھما کر دیکھنے لگے۔

اونہوں! کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے درخت ویسے ہی تھے۔ اس سے پرے دھان اور گنے کے پھیلے ہوئے کھیت بھی ویسے ہی تھے۔

"سلام" ۔ راہ چلتے ہوئے ایک دیہاتی نے سبا باجے کو پہچان کر سلام کیا۔

"اب کے سب فصل برباد ہو گئی مالک" ۔ تانگے والے نے کہا۔ "ایسا سیلاب آیا کہ سب کھڑی فصل بہالے گیا"۔

تب تو ان کا دھان کا کھیت بھی بہہ گیا ہو گا۔ بڑی مشکل سے نہر کے پاس کی زمین ہتھیائی تھی۔ راستے میں مکھیا کا گھر پڑتا تھا۔ مکھیا اپنے گھر کے پاس چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ سبا باجے کو دیکھ کر وہ اٹھا۔ "نمسکار ہے نمسکار۔ کب تشریف لائے؟"

"ابھی ابھی آرہا ہوں" ۔ سبا باجے نے جواب دیا۔ "مکھیا صاحب سلام" ۔ تانگے والے نے کہا۔

تانگہ آگے بڑھا سبا باجے کے گھر پہنچنے سے پہلے سارے گاؤں میں شور مچ گیا۔

"سبا باجے آگئے۔ سبا باجے آگئے"۔

رات ہو چکی تھی۔ پھر بھی دو چار آدمی ملنے آہی گئے سب نے پہلے سبا باجے کی خیریت دریافت کی پھر کاٹھمنڈو کی خبریں معلوم کیں دوسرے دن سویرے سے ہی ملنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ سب سے پہلے مکھیاجی آے۔ مکھیاجی کی تواضع چائے سے ہوئی۔

"ہاں! تو ادھر کا حال سنایئے۔ سنا تھا کہ حضور کی ترقی ہونے والی ہے" ۔ مکھیا نے کہا۔

سبا باجے نے کچھ ٹھہر کر کہا" کس نے کہا آپ سے؟ چرچا تو نہ جانے کتنی باتوں کا ہوتا ہے لیکن وہ سب سچ تو نہیں ہوتیں" ۔

"ارے میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو آپ کو اپنا ہی سمجھتا ہوں۔ اسی لئے پوچھ رہا تھا۔" مکھیا نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ "آپ کو شاید معلوم نہ ہو آپ کے پتاجی کا میرے اوپر بہت احسان ہے۔ تھاپلی میرے اپنے آدمی ہیں۔ اگر ان سے کوئی کام نکالنا ہو تو مجھ سے کہیئے گا" ۔

"آپ کی مہربانی ہے مکھیاجی۔ مجھے معلوم ہے آپ مجھے بچپن سے ہی گود میں کھلاتے رہے ہیں" ۔ سبا باجے نے کہا۔

" تھاپلچی میرے اپنے سگے ماموں کے سگے چچا زاد بھائی کے لڑکے ہیں ۔ وزیر ہونے سے پہلے یہاں آکر مہینوں رہتے تھے ۔ اور تو اور جب وہ لکھنؤ میں پڑھتے تھے تو ان کے لئے ہمارے ہاں سے چاول جاتا تھا اسی لئے کہہ رہا تھا.... میری بات وہ ٹال نہیں سکتے "۔ مکھیا نے کہا۔

سبا باجے کے چہرے پر روشنی پھیل گئی انھیں یہ بات تو معلوم ہی نہیں تھی۔ مکھیا کے کہنے سے شاید انھیں کچھ مدد مل جائے۔

" اچھا تو اب چلوں "۔ مکھیا نے کہا "۔ پھر آؤں گا.... ہاں! آپ سے ایک بات کہنی تھی.... خیر پھر سہی "۔ ایک دوسرے آدمی کو آتے دیکھ کر مکھیا چلا گیا۔

" سلام مالک "۔ آنے والے نے کہا۔

" ارے رام کھلاون! کیا حال ہے بھئی؟ ".... انھوں نے پوچھا۔

رام کھلاون گاؤں کا بنیا ہے ۔ گاؤں بھر کے لئے ضروری چیزیں اس کے ہاں ملتی ہیں ۔ حالانکہ اب اوروں نے بھی دکانیں کھول لی ہیں لیکن رام کھلاون پر سبقت لے جانے کی ان میں سے کسی میں تاب نہیں ہے۔

" کیا بتائیں مالک اس بار ہمارا لڑکا میٹرک میں پاس ہو گیا۔ سوچتا تھا کا ٹھمنڈو میں اسے داخل کرا دوں ۔ اب آپ ہی کوئی انتظام کر سکتے ہیں "۔

" دیکھوں گا ۔ اچھے نمبروں کے ساتھ پاس نہ ہونے پر وہاں داخلہ مشکل ہے ۔ ویسے پڑھائی تو یہاں بھی وہی ہوتی ہے جیسی کہ کاٹھمنڈو میں ۔ طالب علم کو خود محنت کرنی چاہیئے "۔ سبا باجے نے ٹالنا چاہا۔

" لیکن یہ تو سکنڈ میں پاس ہوا ہے "۔ رام کھلاون نے وضاحت کی ۔ پاس کھڑا اس کا لڑکا یہ سن کر مسکرایا۔

" اچھا ۔ اچھا دیکھوں گا۔ سبا باجے بات کو ختم کرنے کے لئے مسکرایا۔

رام کھلاون سلام کرتا ہوا گیا۔ اس کا لڑکا بھی نمسکار سر کہتا ہوا باہر نکلا۔

دس بجے پنڈت جی اپنا پاٹھ ختم کر کے آئے ۔ سبا باجے کی شریمتی جی نے پاٹھ

کروادیا تھا۔ اوم شانتی۔ وشنو شانتی کہہ کر پنڈت نے سبا باجے کے سر پر پانی چھڑکنے کے بعد انہیں کچھ پانی پینے کو دیا اور چندن کا ٹیکا لگایا۔

"بیٹھئے ناگرو۔ چائے پی کر جایئے گا۔ سبا باجے نے کہا۔ پنڈت جی بیٹھ گئے۔

"سگریٹ پیجئے"۔ سبا باجے نے سگریٹ کا پیکٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

پنڈت جی نے سگریٹ سلگا کر ایک لمبا کش لیا اور بولے "واہ کیا عمدہ ذائقہ ہے اس سگریٹ کا۔ اپنے یہاں کی بنی ہوئی ہے؟"

"ہاں گرو یہ جنک پور سگریٹ فیکٹری کی بنی ہوئی ہے"۔ سبا باجے نے جواب دیا۔

"واہ! کیا بات ہے۔ راجہ کی عنایت ہے یہ سب پہلے سوئی بھی نہیں بنتی تھی اب سگریٹ بھی بننے لگی۔ کیا بات ہے۔ واہ؟"

"جنک پور میں سگریٹ بننے لگی ہے۔ یہ بات گرو کو نہیں معلوم تھی کیا"۔

"کیا معلوم ہوتا۔ سگریٹ پینے کی عادت ہو تب تو۔ یہ تو آپ جیسے لوگ پلا دیتے ہیں تو پی لیتا ہوں"۔

پنڈت جی کی سگریٹ سے راکھ نیچے گرنے والی تھی کہ سبا باجے نے ایش ٹرے ان کے سامنے کر دی۔

"حضور سے ایک گزارش کرنی تھی.... کاٹھمنڈو ہی آنے والا تھا۔ مگر حضور کی سواری ہی ادھر آگئی تو غریب کا پیسہ بچ گیا۔ میرا لڑکا عمر والا ہو گیا۔ اس بار کسی طرح سے امتحان بھی پاس کر لیا.... ادھر ہی حضور کی طرف کسی جاگیر کا بندوبست ہو جاتا تو غریب کا بھلا ہو جاتا"۔

"آج کل تو وہاں بھی مشکل ہو گیا ہے گرو.... پہلے کی طرح نہیں ہے بغیر امتحان دیئے جاگیر نہیں ملتی.... اور پھر سنسکرت پڑھے لکھے لوگوں کو تو...."۔ سبا باجے نے اپنا جملہ مکمل نہیں کیا انھوں نے سوچا کہ پنڈت جی اس نامکمل جملے کا مفہوم سمجھ جائیں گے۔

"ہمیں یہ سب کیا معلوم سرکار.... لڑکا آپ کے قدموں میں چھوڑ دیا ہے.... جو

چاہیں سو کریں"۔

"چائے پیئیں گرو"۔ سبا باجے کی شریمتی چائے لے آئی تھیں۔

اسٹیل کے گلاس میں سے سڑ سڑ چائے پی کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔

"اچھا تو سرکار۔ میں رخصت ہوتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں پھر حاضر ہوں گا۔ میری گزارش پر غور کیجئے گا"۔

"اچھا گرو دیکھوں گا"۔ سبا باجے نے کہا۔

"کیا کہہ رہے تھے وہ؟"۔ شریمتی جی نے پوچھا۔

"تمہیں کیا مطلب؟" سبا باجے نے جھلا کر جواب دیا شریمتی جی چپ چاپ باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

سبا باجے وزارتِ داخلہ سے منسلک تھے اسی لئے سفارشی لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی لیکن وہ کسی سے صاف طور پر کچھ نہیں کہتے تھے گول مول باتیں کرکے رہ جاتے تھے۔ دن تو جیسے تیسے گزر جاتا تھا لیکن رات کے وقت بستر پر لیٹنے کے بعد نیند ان کی آنکھوں سے اڑ جاتی تھی۔ بیوی پیر دبانے آتی تھی مگر وہ اسے واپس بھیج دیتے تھے۔ شریمتی جی شوہر کے مزاج اور مسائل سے واقف تھیں اس لئے خاموشی کے ساتھ چلی جاتی تھیں ورنہ جواب دینا انھیں بھی خوب آتا تھا۔

"اب فکر کرنے سے کیا ہوگا؟ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا"۔ وہ کہنا چاہتی تھیں مگر کہتی نہیں تھیں۔

سنگھ دربار کے گیٹ پر پہریدار انھیں دیکھ کر سلام کرتا تھا۔ سکریٹری کے اسٹینو ہونے کی وجہ سے دفتر میں ان کی بہت قدر تھی۔ وہ اکثر مقامی بازار سے گھی وغیرہ خرید کر اپنے افسروں کو یہ کہہ کر نذر کرتے کہ یہ خاص اپنے گاؤں سے منگوایا ہے ان کے والد بھی زمانہ جنگ میں رائٹر تھے۔ انھوں نے اسی گاؤں میں گاؤں کی جائداد حاصل کی تھی۔ اس میں مزید اضافے کا کام سبا باجے نے انجام دیا تھا۔

دو چار روز تو ان کے ہاں لوگوں کی خوب بھیڑ رہی لیکن کچھ دنوں بعد کوئی بھی

نہیں آنے لگا۔ایک دن مکھیا سے ان کی ملاقات ہو گئی۔

" کیا بات ہے بھائی ؟اس بار تو بہت دنوں ٹک گئے گاؤں میں۔" مکھیا نے کہا۔ سبا باجے کے چہرے پر جیسے سیاہی پھر گئی۔

" ہاں ! چھٹیاں بہت دنوں سے باقی چلی آرہی تھیں سو سوچا.... " انھوں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

" لیکن آپ تو دھان بیچنے کے دنوں میں بھی نہیں آتے تھے مگر اب.... " مکھیا اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکا کیونکہ سبا باجے نے بڑی عجلت میں کہا۔

" اب چلوں.... ذرا جلدی ہے۔سی۔ڈی۔او سے کچھ کام ہے"۔

" سی۔ڈی۔او صاحب ہیں کہاں ؟وہ تو صدر مقام گئے ہوئے ہیں"۔ مکھیا نے کہا۔

" ہاں ہاں ! صدر مقام ہی جا رہا ہوں"۔ سبا باجے نے جلدی سے قدم آگے بڑھا دیئے۔

" میری بات بھولئے گا نہیں.... تھاپلی سے کوئی کام ہو تو.... " مکھیا نے زور سے کہا تھوڑی دو جا کر سبا باجے رک گئے اب جائیں تو کہاں جائیں ؟انھیں چاروں طرف سے سناٹے نے گھیر لیا تھا۔اگر وہ صدر مقام نہیں جاتے تو مکھیا کیا کہے گا ؟.... لیکن صدر مقام میں بھی تو سرکلر آگیا ہو گا اب تک .... اب انھیں پوچھنے والا کون ہو گا ؟آج سویرے آئینے میں انھیں اپنا چہرہ کتنا اجنبی معلوم ہوا تھا جیسے عہدے سے ہٹا دیئے جانے کے بعد وہ وہ نہ رہے ہوں.... اچانک انھیں چکر آگیا اور وہ وہیں ایک درخت کے نیچے نڈھال ہو کر بیٹھ گئے۔

میکسم گورکی

(روسی)

محبت

سیماگا شراب خانے میں ایک میز پر اکیلا بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے ووڈکا کی بوتل اور گوشت کی طشتری پڑی تھی۔ باہر موسم خزاں کے آخری دنوں کا خوفناک طوفان منڈلا رہا تھا اور برف گر رہی تھی لیکن شراب خانے کے اندر گرمی تھی اور شور تھا اور ایک جانی پہچانی سی مہک۔

سیماگا دھوئیں میں سے دروازے کی سمت ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ یکایک دروازہ کھلا اور چیتھڑوں میں لپٹی ایک گول مٹول سی چیز لڑھکتی ہوئی اندر داخل ہوئی .... وہ ایک لڑکا تھا۔

"بچاؤ.... لوگو بچاؤ.... اس نے تیکھی زوردار آواز میں کہا.... "چھاپہ پڑ رہا ہے....

سب لوگ اچانک خاموش ہو گئے۔

"وہ لوگ دونوں طرف سے آ رہے ہیں" ۔ لڑکے نے کہا۔ "دو افسر گھوڑوں پر سوار اور کئی سپاہی پیدل" ۔

"کس کا تعاقب کر رہے ہیں وہ" ؟

"شاید سیماگا کا۔ انہوں نے اسی کے بارے میں پوچھا تھا" ۔

"سیماگا اپنی ٹوپی سر پر جماتا ہوا بغیر کسی گھبراہٹ کے اٹھا۔ وہ لڑکا شراب خانے سے باہر نکل گیا۔ سیماگا بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر نکلا۔

باہر ٹھنڈی، پھنکارتی ہوئی ہوا سڑک پر سے گزر رہی تھی ۔ سیماگا آگے بڑھا اور شہر کے درمیانی علاقے کی طرف چل پڑا ۔ چلتے ہوئے وہ کسی محفوظ مقام کے بارے میں سوچ رہا تھا جہاں وہ چھپ سکے لیکن ایسی کوئی جگہ اسے نظر نہیں آئی ۔ طوفان کے شور میں اس نے ایک عجیب سی آواز سنی جو کہیں سامنے سے آرہی تھی .... وہ کسی بچے کے آہستہ آہستہ رونے کی آواز تھی ۔ سیماگا کسی جنگلی جانور کی مانند گردن آگے کی طرف بڑھا کر ایک جگہ رک گیا ۔ کچھ دیر کے بعد اسے پھر وہی آواز سنائی دی اس بار یہ آواز اس کے پیروں کے قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوئی ۔ وہ چونکا اور پھر اس نے جھک کر ٹٹولا ۔ بالآخر ایک گول مٹول سی چیز کو اٹھا کر اس نے اس پر سے برف صاف کی ۔

" اچھی ملاقات ہوئی " ۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے بچے کو دیکھتے ہوئے کہا بچے میں حرارت تھی اور وہ ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا ۔ وہ پھر رونے لگا ۔

" چہ ۔ چہ " ۔ سیماگا نے سختی سے کہا ۔ " اگر ذرا بھی آواز نکالی تو تجھے آدمی بنا کر رکھ دوں گا ۔ چہ ۔ چہ ۔ چپ ہو جا ۔ بیوقوف کہیں کا " ۔

بچہ روتا رہا ۔

" اچھا تو روئے جا " ۔ سیماگا نے کہا ۔ " تیری ماں کوئی چڑیل ہو گی جو تجھے اس طرح چھوڑ کر چلی گئی ۔ مجھے مل جائے تو اس کے دانت توڑ کر رکھ دوں ۔ ڈائن کہیں کی " ۔ اس نے بچے کو اپنے کوٹ کے اندر لے جا کر سینے سے لگا لیا ۔ کوٹ کے اندر سے بچے کی آواز باہر نہیں نکلی ۔ وہ ہاتھ پاؤں چلاتا رہا اور سیماگا اس کے جسم کی حرارت محسوس کرتا رہا ۔

کچھ آگے جا کر سیماگا چونکا اور کھڑا ہو کر اونچی آواز میں بولا ۔ " ارے یہ تو دودھ پینا چاہتا ہے ۔ اپنی ماں کا دودھ ۔ مجھے اپنی ماں سمجھ رہا ہے ۔ واہ رے چوہے ۔ بھلا مجھ سے کیا ملے گا تجھے ؟ "

ہوا بے تحاشا شور مچاتی رہی ۔

" ہاں تو اب سو جا ۔ آنکھیں موند کر سو جا ۔ میرے پاس دودھ نہیں ہے ۔ سو جا

.... میں تجھے ایک لوری سناتا ہوں "۔ سیماگا نے دھیمی نرم آواز میں گانا شروع کیا۔ "تم ایک ہرجائی، ہو دل کو اچاٹ کر دینے والی آخر میں کس لئے تم سے محبت کروں " یہ گیت وہ کسی لوری کی دھن میں گا رہا تھا۔

" میں آؤں گا اور ایک رات آکر تمہیں ملوں گا اور جب میں جاؤں گا تو تنہائی میں تم ڈرو گی "۔ اس کے چہرے پر پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ یہ پگھلی ہوئی برف کا پانی تھا۔ سیماگا کا دل کسی بوجھ تلے دبا ہوا تھا اس نے کبھی ایسی جان لیوا تنہائی محسوس نہیں کی تھی۔

وہ اس طرح چلتا رہا۔

کچھ دیر بعد اسے اپنے پیچھے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی ۔ پھر گھوڑوں پر سوار سپاہیوں کے سائے دکھائی دیئے ۔ چند ہی لمحوں میں سپاہی اس کے پاس پہنچ گئے۔

بیک وقت دو آوازوں نے پوچھا۔" کون ہو؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

" یہ ؟.... ایک بچہ ہے "۔

" تو چلو۔ میرے گھوڑے کے آگے آگے چلو "۔

" مجھے دونوں گھوڑوں کی اوٹ میں، ان کے بیچ چل لینے دو ورنہ سردی سے یہ بچہ مر جائے گا "۔

سپاہیوں نے اسے گھوڑوں کے درمیان چلنے کی اجازت دیدی ۔ وہ تھانے پہنچے۔

" تو اسے پکڑ ہی لیا تم نے ؟ بہت اچھا کیا "۔ انسپکٹر نے سیماگا کی طرف دیکھتے ہوئے سپاہیوں سے کہا۔

" اس بچے کا کیا ہو گا " ؟ سیماگا نے سر جھٹک کر پوچھا۔" یہ کہاں سے اٹھا لیا تم نے ؟ "

" سڑک پر پڑا تھا.... " اس نے بچے کو اپنے کوٹ میں سے باہر نکالا۔

" یہ تو مرا ہوا ہے "۔ انسپکٹر نے کہا۔

" مرا ہوا ہے ؟ ".... سیماگا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس نے بچے کی طرف غور

سے دیکھا اور پھر اسے میز پر لٹا دیا۔اس کے بعد اس نے مایوس نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ بچے کی موت کے ساتھ ہی اس کے وہ جذبات بھی مر گئے تھے جو سڑک پر چلتے ہوئے اس کے دل میں پیدا ہوئے تھے۔اس نے ایک بار پھر بچے کی جانب دیکھا اور بولا "خوب ہے تو بھی تیری بدولت ہی میں پکڑا گیا ہوں اور اس کے بدلے میں مجھے کیا ملا؟ .... میں تو سوچ رہا تھا کہ.... مگر تو مجھے ایک دم چھوڑ کر چلا گیا۔اچھا تیری مرضی "۔اور وہ بے تحاشا اپنی گردن کھجلانے لگا۔

جولیس فیوچک

(چیکو سلواکی)

بلب خور

شام ہو گئی تھی ۔ دھیمی روشنی شہر کے اس گندے حصے میں چاروں طرف پھیل ہوئی تھی جب کہ چرچ کی طرف اندھیرا گہرا ہوتا جارہا تھا ۔ میں نے دیکھا کہ اس طرف کچھ بھیڑ تھی ۔ دائرہ نما بھیڑ میں پراسرار خاموشی پھیلی ہوئی تھی ۔ وہاں کیا ہو رہا تھا یہ جاننے کے لئے میں بھی رک گیا ۔

بھیڑ کے بیچوں بیچ ایک مریل سا آدمی بیٹھا تھا جس کے منھ سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں ۔ ایک بوڑھی عورت جو عین میرے سامنے کھڑی تھی تھوڑی دیر کے لئے تصویر حیرت بن گئی تھی پھر خوف بھری آواز میں اپنے آپ سے بولی تھی "اے خدا میری مدد کر" ۔ اچانک پولیس کی سیٹی سنائی دی تھی اور پل بھر میں ہی وہ سارا منظر صاف ہو گیا تھا ۔ لوگ تتر بتر ہو گئے تھے حالاں کہ شہر کے اس حصے میں جو چرچ کے پچھواڑے تھا اب بھی ہلکی ہلکی رشنی پھیلی ہوئی تھی ۔

لگ بھگ ایک ہفتے بعد میں نے دوبارہ ویسی ہی بھیڑ دیکھی تھی ۔ دوپہر کا وقت تھا ۔ سورج بہت تیزی سے چمک رہا تھا ۔ چاروں طرف کا منظر صاف تھا ۔ یہاں پرانے شہر کے اندھیرے حصے کی طرح کوئی اسرار نہیں نظر آرہا تھا بلکہ پراگ کے جدید مکانوں میں اس کونے کی طرف جہاں اکثر ٹریفک جام ہو جانے کے سبب بھیڑ اکٹھی ہو جاتی ہے وہاں آج بھی ٹرام کاروں کے رکنے کے بعد سڑک پار کرنے کے انتظار میں لوگ کھڑے

تھے تبھی سڑک کے اس شور میں ایک کانپتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

"میں تمہیں دھوکا دے سکتا ہوں لیکن دیکھو یہ دھوکا نہیں بلکہ محنت کا کام ہے اور جب تک میں تمہارے پاس ہوں تم میں سے کوئی بھی اسے آزما سکتا ہے۔ میں اکثر اسے شیطان کا کھانا کہتا ہوں۔ ان کرتبوں کو کمرے کے اندر کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ یہاں تیز ہوا ہے اور ان روٹیوں کی لپٹیں میری آنکھوں کو جلا سکتی ہیں لیکن میں انھیں اپنی زبان پر رکھتے ہوئے بھی نہیں ڈرتا۔ اگر آپ میں سے کسی کو جلدی نہ ہو تو دیکھ لیجئے لیکن میں اپنا کھانا اکیلے ہی کھاؤں گا"۔

اس کے بعد وہ مریل نوجوان ایک جلتی ہوئی روٹی کھانے لگا۔ اس کے منھ سے آگ کی لپٹیں نکلنے لگیں بالکل ویسی ہی لپٹیں جیسی میں نے ایک ہفتہ قبل پرانے شہر میں دیکھی تھیں وہاں یہ پراسرار نظر آرہی تھی مگر اس وقت تو یہ سچ مچ ایک حیرت انگیز فن تھا۔ اس نوجوان کا چہرہ ہر لمحہ اور زیاہ سرخ ہوتا جا رہا تھا کنپٹیوں کی رگیں زر زور سے پھڑک رہی تھیں اور آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔

"یہ کوئی لذیذ کھانا نہیں ہے لیکن اگر میں اسے نہ نگلوں تو پھر کھاؤں گا کیا؟ سچ مانئے میں ایک بے روزگار فن کار ہوں۔ اگر آپ میں سے کوئی مجھے کچھ دے سکے تو میں جانتا ہوں یہ وقت بہت کٹھن ہے پھر بھی آپ مجھے تانبے کا ایک سکہ تو دے ہی سکتے ہیں"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے ٹین کی ایک پلیٹ کو ہاتھ میں لے کر مجمع کا ایک چکر لگایا تھا بیس ہیلر کے لگ بھگ اس کی پلیٹ میں جمع ہو گئے تھے ایک کراؤن بھی پورا نہ ہوتے دیکھ کر اس نے دوبارہ چکر لگانا شروع کر دیا اور بولا "ذرا ان ناخنوں کو دیکھو۔ کیا تمہارے ناخن ایسے ہیں؟ شاید نہیں.... یہ صرف پندرہ سنٹی میٹر لمبے ہیں اسی لئے تم میں سے کوئی اپنے ناخنوں کو اس طرح نہیں موڑ سکتا"۔ اور اس نے اپنے لمبے لمبے ناخنوں کو اپنے نتھنوں میں گھسیڑ کر کیل کی طرح ٹھونکنا شروع کر دیا۔

"آج میں اس کے باوجود ہنس سکتا ہوں لیکن جب میں یہ سیکھ رہا تھا اس وقت

اکثر درد کے مارے بری طرح چیخ پڑتا تھا۔ میرے والد اکثر کہتے تھے کہ زندہ رہنا ہے تو یہ سب لازمی طور پر سیکھنا پڑے گا اسی لئے جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو میں زندہ ہوں۔ میرے والد کو دنے کی بہت اچھی ٹرکس جانتے تھے لیکن ایک دن وہ دوڑتے ہوئے گھوڑے پر صحیح وقت پر نہیں کود پائے اور ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی انہوں نے دم توڑ دیا میں بالکل اکیلا رہ گیا اس وقت میں سولہ سال کا تھا۔ میں نے جتنا کچھ اپنے والد سے سیکھا تھا اسے ہی لوگوں کے سامنے دکھانا شروع کر دیا۔ سیکھے ہوئے اس خزانے میں سے ابھی تم کو ایک کرتب دکھاتا ہوں"۔

اچانک سورج کی روشنی میں لوگوں نے دیکھا کہ تلوار کی دھار چمک رہی ہے۔

"اسے دیکھنے کے بعد مشق کے ذریعے تم بھی کر سکتے ہو۔ میں ساٹھ سنٹی میٹر کی تلوار کو اپنے گلے کے اندر اتارنے جا رہا ہوں۔ اگر تم میری جگہ ہوتے تو تلوار کی نوک تمہیں پیٹ میں چبھتی محسوس ہوتی یہ ایک عجیب وغریب کھانا ہے جو بہت مشکل سے ہضم ہوتا ہے مگر ابھی میں بھوکا ہوں اپنا پیٹ بھرنے کے لئے میں اب آپ کو ایک اور کھیل دکھاتا ہوں"۔

اس نے اپنے قدموں کے پاس پڑے کانچ کے بلبوں میں سے سب سے بڑا بلب اٹھالیا۔

"چیکو سلواکیہ میں کانچ نگلنے والا میں اکیلا ہوں دراصل ہم دو تھے لیکن دوسرا تھوڑے دنوں پہلے مر گیا جب بہت دنوں تک اسے کوئی بھی نوکری نہیں ملی تو اس نے مایوس ہو کر کانچ کھانے کے بعد چکنائی کھانا بند کر دیا۔ چکنائی کھائے بغیر بلب نہیں کھایا جا سکتا۔ کانچ نے اس کی آنتوں کو کاٹ ڈالا اسی لئے آج میں اکیلا ہوں"۔

یہ کہہ کر وہ بلب کو کھانے لگا۔ کانچ کے ٹکڑوں کو وہ اس طرح چبا رہا تھا جیسے وہ بہت مزے دار ہوں۔ آہستہ آہستہ اس نے پورا بلب کھالیا پھر اس نے دوسرا بلب اٹھایا اور بولا....

"یہ میرا دوپہر کا کھانا ہے۔ بلب کھانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پیٹ بالکل

صاف اور خالی ہو مجھے بلب کھانے میں کبھی کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کیونکہ کرتب دکھانے سے پہلے اور بعد میں ہمیشہ میرا پیٹ خالی ہی رہتا ہے۔ میں دن بھر میں چھ سے آٹھ بلب کھالیتا ہوں جو سارے دن کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ اگر آپ مجھے تھوڑا بہت دے سکیں تو آج میں اپنا دوپہر کا کھانا آسانی سے کھا سکوں گا"۔

وہ آدمی ذرا رکا پھر بولا۔

"میں نے جب بھی کہیں باہر اس فن کا مظاہرہ کیا تو لوگوں نے میرے فن کو بہت سراہا اور بے انتہا داد دی لیکن اب جب کہ میری زبان جلی ہوئی ہے، پیٹ میں تلوار اور دانتوں کے درمیاب بلب ہے تو مجھے چاروں طرف نظر رکھنی پڑرہی ہے کہ کہیں کوئی پولیس والا نہ آجائے۔ اکثر یہاں کوئی نہیں آتا۔ ہر پولیس والا شاید ہم پر ترس کھا کر نظرانداز کرتا ہوا یا اسے دوسرے پولیس والے کی ذمہ داری قرار دیتا ہوا نکل جاتا ہے۔ ایسے میں مجھے لگتا ہے کہ یہاں ان اونچے اونچے مکانوں کے آس پاس صرف پولیس والے ہی ایسے ہیں جن میں تھوڑی سی انسانیت باقی ہے وہ شاید اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے عاجز آتے جارہے ہیں پرانے شہر میں پولیس ہمیں بہت تنگ کرتی ہے یہاں تو پھر بھی اچھا ہے کیونکہ یہاں تین قسم کی پولیس حرکت میں ہے شاید اسی لئے وہ زیادہ توجہ نہیں کرتے"۔

وہ شاید دم لینے کو ایک بار پھر رکا اور تھوڑی دیر رک کر بولا۔

"منہ سے آگ اگلنا، تلوار نگلنا اور بلب کھانا حقیقی طور پر تمہاری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ ان سب چیزوں کے باوجود آج کا وقت بہت خراب ہے۔ اگر تم میں سے کوئی کچھ دے کر اسے آزمانا چاہتا ہے تو آزما لے۔ آزمائش کے بعد ہی پتہ چلے گا کہ یہ سب نہ کوئی جادو ہے نہ معجزہ کیونکہ تم میں سے کچھ لوگ مجھ پر اس بات کے لئے بھی تو رشک کر سکتے ہیں کہ مجھے بلبوں کا ناشتہ اور کھانا اتنی آسانی سے کیسے مل جاتا ہے جبکہ زمانہ اتنا خراب ہے۔

برانکو کوپیچ

(یوگوسلاوی)

ہم سفر

اسکواڈ کمانڈر نکولے تینا اپنی بریگیڈ کے سربراہ سے پیچھے کی کمان کی طرف جا رہا تھا۔ اسے ڈاک اور تیس لاکھ لائرے کر جانا تھا۔ یہ اس کا ہمیشہ کا کام تھا لیکن اس بار چھ سال کی ایک ننھی یہودی لڑکی بھی اس کے ساتھ بھیجی جا رہی تھی۔ اس لڑکی کو اسے کمان کے سپرد کرنا تھا تاکہ وہ اسے دشمنوں سے آزاد کسی علاقے میں آباد کر سکیں۔ یہ کام اس کے لیے ایک دردِ سر تھا۔

"یا خدا! مجھے بچوں کو بہلانا نہیں آتا۔ اس کام میں میں کچا ہوں"۔ اس نے ننھی بچی پر نظر ڈالتے ہوئے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے سکریٹری سے کہا تھا۔

"ارے بھائی! یہ بھی کوئی کام ہے؟ کوئی مورچہ تو نہیں ہے یہ"۔ سکریٹری نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ بات تو میں جانتا ہوں، مگر فرض کرو راستے میں ٹینک حملہ کرتے ہوئے آجائیں تو یہ بے چاری کیسے جان بچائے گی؟"

"بس یہی ہے تمہاری مردانگی!" سکریٹری نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ارے بھائی! جس طرح مشین گن بغل میں دبائے تم میلوں بھاگ سکتے ہو اسی طرح لڑکی کو بغل میں دبا کر بھاگ جانا۔ دیکھو تو یہ کتنی ہلکی پھلکی بچی ہے"۔

"مشین گن کی بات اور ہے یہ تو جیتی جاگتی بچی ہے"۔

"تم بھی کیسی باتیں کر رہے ہو؟.... "اب سکریٹری بھی جھنجھلا گیا تھا۔" ابھی کچھ ہی دنوں پہلے تو ہم نے اس بچی کو دشمنوں کے پنجے سے چھڑایا تھا اور اب تم اس طرح کی باتیں کر رہے ہو۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟ کیا اسے کہیں پھینک دیں بتاؤ؟۔"

"پھینکنے کی بات کون کرتا ہے.... میں تو.... "اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سکریٹری کی بات کا کیا جواب دے۔

اور اس طرح وہ بچی چپ چاپ اس کے پیچھے لگ گئی تھی۔ لڑکی کے چلنے میں اس کی خود اعتمادی نظر آرہی تھی۔ یہ دیکھ کر نک نے اس سے پوچھا۔" کیوں ری لڑکی! مجھ سے ڈر نہیں لگتا؟"

"نہیں.... "بچی نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس کے چہرے پر جمائے ہوئے کہا۔ اس کی معصومیت نے نک کو الجھن میں ڈال دیا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ ننھی سی بچی کتنی سیانی معلوم ہو رہی ہے۔ نہ جانے یہ کس دیس کی ہے؟ اس کے بال کیسے سرخ ہیں۔ رات کوئی کہہ رہا تھا کہ یہ یہودن ہے۔

"اے لڑکی تیرا نام کیا ہے؟" نک نے تقریباً ڈانٹنے کے انداز میں پوچھا۔

"ایرنا"۔

"ایرنا؟ یہ کس قوم کا نام ہے؟ ترک ہے یا جرمن یا پھر یہودی۔ کون جانے۔ ابھی سے گھبرا رہے ہو یار نک ابھی تو اس جنگ میں نہ جانے کتنے ملکوں کے لوگوں کو ادھر ادھر کرنا پڑے گا۔ سوچتے سوچتے نک کے قدم تیز ہو گئے۔ پھر اس نے اس لڑکی سے پوچھا۔" اے چھوکری تو کون ہے؟"

"جی! کیا کہا آپ نے؟"

"ارے میں کوئی پادری ہوں جو تو جی جی کر رہی ہے۔ میں پوچھتا ہوں تو کون ہے؟"

"چھوٹی بچی"۔

"واہ کیا جواب ہے۔ چھوٹی بچی.... جیسے میں کہہ رہا ہوں کہ تو جرمن فوج کی

کمانڈر ہے"۔ نک بولتے بولتے اچانک رک گیا۔ پھر اپنے سوال کو دہراتے ہوئے بولا۔
"میرا مطلب تھا کہ تو کس قوم کی ہے یعنی سربین ہے یا کروٹ یا مسلمان؟"
بچی چلتے چلتے رک گئی۔ اپنے آگے چلتے ہوئے رائفل بردار سپاہی سے جس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اور جو لمبے لمبے قدم اٹھا رہا تھا، اب اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ کانپنے لگی۔ اس کی نگاہیں نک کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں اور پتلیاں پھیل گئی تھیں۔ اسکواڈ کماڈر نک نے اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا.... "کیا ہوا۔ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہے؟"۔

بچی نے آہستہ سے کہا۔ "صاحب! آپ مجھے مار ڈالیں گے؟"

"ارے چوزہ! کیا تو نے کوئی گناہ کیا ہے جو میں تجھے مار ڈالوں گا؟"

چھوٹی بچی اسی طرح سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "کیونکہ میں یہودی ہوں"۔

اسکواڈ کمانڈر نے مصنوعی غصے سے اسے ڈانٹا۔ "شیطان کہیں کی۔ کیا میں تجھے فاشسٹ دکھائی دیتا ہوں؟ ذرا یہ تو بتا کہ یہ سب باتیں تو نے کہاں سے سیکھیں؟"

ایرنا اب بھی نک کے چہرے کی طرف ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ وہ ہٹا کٹا اور غیر مہذب سپاہی یہی زبان جانتا تھا تو پھر اس سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ وہ پھر غرایا.... "اچھا اب یہ بتا کہ تو نے کیا گناہ کیا ہے؟ یہ کدو کی طرح اپنا چہرہ کیوں لٹکا لیا تو نے؟ کیا مجھ سے ڈر لگتا ہے۔؟"

چھوٹی بچی دھیمے سے بولی۔ "ہاں!"

"ڈرتی ہے؟ تو بتا میں کیا کروں؟ اچھا میری یہ رائفل تو ہی لے لے۔ اسی کو دیکھ کر ڈر رہی ہے نا کہ میں تجھے گولی مار دوں گا.... لے پکڑ لے"۔

یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی خودکار رائفل اس بچی کے کندھے پر ٹانگ دی اور پھر دانت بھینچتے ہوئے بولا۔ "یہ میری بدقسمتی تھی کہ تجھے میرے پیچھے لگا دیا۔ اب اتنی دیر سے میں تجھے یہی نہیں سمجھا پا رہا ہوں کہ تجھے مارنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اچھا بتا کیا اب بھی تجھے مجھ سے ڈر لگ رہا ہے؟"

بچی نے نگاہیں نیچی کر لیں اور پلکیں جھپکاتے ہوئے ہکلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔
"ہاں ڈر تو لگتا ہے"۔

"شیطان کہیں کی۔ اچھا بتا تجھے مجھ سے ڈر کیوں لگتا ہے؟"۔ نک نے اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "ذرا مجھ دیکھ۔ دیکھ میں بھی تو بیہودی ہوں۔ ہاں ہاں سینٹ نکولس کی قسم۔ کیا ان لوگوں نے ہمارے ساتھ کوئی برا سلوک کیا؟ کیا تم پر کوئی زیادہ ظلم ہوا؟"

چھوٹی بچی چپ ہو گئی۔ اس نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ اس کا چہرہ اس کے سر کے گھنے اور تانبے جیسے بالوں کے نیچے چھپ گیا تھا۔ نک کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور بچی کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔

"دیکھو، تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟ میں تم سے ہار مانتا ہوں.... تمہارے لئے میں نے اپنا مذہب تبدیل کر دیا۔.... پرانے یوگوسلاویہ کی طرح میں تمہاری پناہ میں آگیا ہوں پھر بھی تم؟.... اب تم کیا چاہتی ہو۔ کیا میں سامنے اس ندی میں کود کر جان دیدوں؟"

نکولے تینا اس بچی کو لے کر اس چھوٹی سی ندی کے پل پر آگیا اور نیچے پانی میں اچھل کود کرتے ہوئے بینڈکوں کے بچوں کو دیکھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں پانی میں کود پڑوں تو لڑکی کو اچھا سبق ملے گا۔ چھوٹی بچی اپنی اداس آنکھوں سے سپاہی نک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنا پورا وزن کبھی ایک ٹانگ پر ڈالتی اور کبھی دوسری ٹانگ پر۔

"چلو اب چلنا بھی ہے" نک نے کہا۔

"ہاں چلو" ۔ چھوٹی بچی جیسے ابھی مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں رائفل ابھی تک لٹکی ہوئی تھی اور مورتے گھسٹتی ہوئی نک کے پیچھے چل رہی تھی۔ تھوڑی دیر یوں ہی چلنے کے بعد اس نے ڈرتے ہی کہا۔ "سپاہی جی! رائفل بہت بھاری

ہے۔میں اسے نہیں اٹھا سکتی"۔

"ٹھیک ہے، مجھے دیدے۔تیری خاطر میں ہی اسے ڈھولوں گا"۔

اس اثنا میں لڑکی کا خوف پگھلنے لگا تھا۔تھوڑی سی ہمت کر کے اس نے پوچھا۔

"سپاہی جی ہم کس راستے سے جا رہے ہیں؟"

"کیا کہا تم نے؟"

"میرا مطلب ہے ہم کس سڑک سے جا رہے ہیں؟

"سڑک، سڑک سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"سپاہی جی، آپ تو بے وقوف ہیں"۔

"بے وقوف ہو گا تیرا باپ، میں نہیں"۔نک نے گھور کر لڑکی کو دیکھا اور زیر لب بڑبڑایا۔"اب یہاں اسے سڑک چاہیے۔ارے یہ جنگل ہے جنگل ہم جنگل سے گزر رہے ہیں"۔

"جنگل، جنگل میں تو ڈاکو ہوتے ہیں"۔لڑکی نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"اوہو ڈاکو! تو تم بھی اس جھوٹی افواہ پر یقین کرتی ہو۔۔ارے بچی! ڈاکو تو شہروں میں ہوتے ہیں۔تمہاری سڑکوں پر"۔

اب وہ برچ کے درختوں سے ڈھکی پہاڑی پر آہستہ آہستہ چڑھ رہے تھے۔اچانک بچی نے نک کا ہاتھ کس کر پکڑ لیا اور خوف سے چیخی۔

"سپاہی جی، وہ دیکھو بھیڑیا"۔

نکولے تینا نے جلدی سے اس طرف دیکھا جدھر بچی اشارہ کر رہی تھی اور پھر بچی کا مذاق اڑانے کے انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔"واہ واہ، یہ بھیڑیا ہے؟ کیا کہنے۔اری بیوقوف یہ تو گدھا ہے"۔اس نے اس جانور کی طرف حقارت سے دیکھا جیسے گدھا ہونے کا وہ خود ذمہ دار ہو۔

"اسے بھیڑیا کہہ رہی ہے۔اب بتا بیوقوف کون ہے۔تو، یا میں؟"

اب اوک کے پیڑوں کا جنگل شروع ہوا تو نکولے تینا رکا۔اس نے کارتوس

سے بھرا اپنا کمر بند کھولا۔ اور بچی کی طرف دیکھنے لگا۔

" تم تھک گئی ہوں گی آؤ تھوڑی دیر بیٹھ کر ستالیں۔ اوک کے درختوں کی ایک قطار کے نیچے وہ لیٹ گیا۔ سکوں کی تھیلی اس نے اپنے سر کے نیچے رکھ لی اور پھر ایک بے فکری کی سانس لیتے ہوئے بدبدانے لگا۔ میں شرطیہ کہتا ہوں کہ وہ امیر لوگ چینا چاہتے تھے۔ ان کے سرہانے بھی لاکھوں کی تھیلی ہوتی لیکن وہ چھاؤں میں یہی سوچتے ہوئے سوئے کہ باقی لوگ جائیں بھاڑ میں "۔

اسے ابھی نیند کی پہلی جھپکی آرہی تھی کہ بچی کی چیخ نے اسے پھر سے چونکا دیا....

" ارے وہ کیا ہے ؟ سپاہی جی ادھر دیکھو "۔

نیند سے مندتی آنکھوں کو جبراً کھولتے ہوئے نکولے تینا نے ادھر دیکھا۔ قریب کے ایک درخت کے تنے پر ایک ہلکی سی پرچھائیں پڑی اور پھر شاخوں میں کہیں غائب ہو گئی۔

" کیا ہے وہ ؟ اری بیوقوف وہ تو گلہری ہے۔ گلہری سے بھی کیا کسی کو ڈر لگتا ہے تو تو ایسے ڈر رہی ہے جیسے دشمن کی فوج دیکھ لی ہو "۔

درخت پر نظریں جمائے وہ لڑکی نکولے تینا سے اور قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ چاچا " مجھے ڈر لگتا ہے "۔

" ارے ارے " ۔ اسکواڈ کمانڈر اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے دھمکانے لگا۔

" جانتا تھا، تو اسی طرح تنگ کرے گی۔ خدا نہ کرے۔ اگر دشمن کے ٹینک ادھر آگئے تب تو تو اس طرح چیخ چیخ کر مجھ بھی پکڑوا دے گی۔ اور ہم دشمن کے شکنجے میں چلے جائیں گے "۔

ایرنا نے گمبھیر ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ " چاچا میں ٹینکوں سے نہیں ڈرتی "۔

" لو اب اس کی بات سنو " ۔ اسکواڈ کمانڈر چیخا۔ " تم جیسی ڈرپوک لڑکی ٹینکوں سے نہیں ڈرتی۔ واہ کیا کہنے ! "

" سچ کہتی ہوں، میں ٹینکوں سے نہیں ڈرتی۔ وہ تو ہماری گلی سے روز ہی گزرتے

تھے۔ چھوٹے ٹینک بھی اور بھاری ٹینک بھی بڑے لوگ تو انھیں دیکھ کر ڈرتے تھے مگر ہم بچے بالکل نہیں ڈرتے تھے"۔

"سچ کہتی ہو؟"

"چاچا تم ٹینک سے ڈرتے ہو؟"

نکولے تینا کو کوئی جواب نہیں سوجھا۔ اس نے کھنکھار کر اپنا گلہ صاف کیا اور آس پاس دیکھ کر دھیمے لہجے میں کہا۔ "اچھا میری بات سنو اگر تم ٹینکوں سے نہیں ڈرتیں تو پھر میں بھی کیوں ڈروں گا؟ مگر سچ یہ ہے کہ کوئی ٹینک اگر پہاڑی پر دھڑدھڑاتا ہوا چڑھ رہا ہو..... خیر چھوڑو....."

بچی نے اپنی آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔ "ان پر بھی شیطان کا چہرہ بنا ہوتا ہے؟"

"بالکل وہی"۔ سپاہی نے اقرار کیا۔

بچی ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ پھر سپاہی کے پاس آکر اسے ایک انگلی سے چھو کر آہستہ آہستہ سے پوچھا۔ "چاچا تم کس چیز سے ڈرتے ہو؟"

"کیا واہیات سوال ہے۔ میں بھلا کس چیز سے ڈروں گا؟"۔ نک نے فخر سے کہا مگر بچی کے معصوم سوال نے اس کے دل کو چھو لیا تھا۔ اپنے جذبات کو چھپاتے ہوئے اس نے مصنوعی غصے سے بچی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "یہ چاچا واچا کیا ہوتا ہے۔ میرا نام نکولے تینا ہے۔ تم مجھے چاچا نکولا کہہ سکتی ہو"۔

اسکواڈ کمانڈر نے پھر سے خطوط سے بھرا تھیلا اپنے کندھے سے لٹکا لیا۔ رائفل اٹھائی، کمر بند کسا اور جیسے کسی دوسرے سپاہی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "کامریڈ ایرنا اپنے سفر پر آگے چلیں"۔

"چلو چلیں کامریڈ نکولا"۔ لڑکی نے بھی اسی انداز میں کہا۔

جو جونزسن

(ناروییجین)

باپ

وہ اپنے علاقے کا سب سے زیادہ بااثر اور امیر آدمی تھا۔ اس کا نام تھورڈ اوورا س تھا۔ اس نے پادری سے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ میں اپنے بیٹے کا بپتسمہ کرانا چاہتا ہوں"۔

"اس کا نام کیا رکھنا چاہیں گے؟"

"فن ۔ یہ میرے والد کا نام تھا"۔

"خیر طلب گواہ کون کون ہوں گے؟"

اور اس نے پادری کو ان سب کے نام بتا دیئے وہ سب مرد اور عورتیں اس کے معزز رشتہ دار تھے۔

"تمہاری کچھ اور بھی خواہش تھی؟"

وہ معزز زمیندار تھوڑی دیر تک سوچتا ہوا کھڑا رہا"۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنا بپتسمہ وہ خود کرے"۔

"کس دن؟"

"آئندہ ہفتے کے روز۔ دوپہر بارہ بجے"۔

"کچھ اور؟" پادری نے سوال کیا۔

"کچھ اور نہیں"۔ اوورا س اپنا ہیٹ اٹھا کر چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ پادری کھڑا ہو گیا۔ اس نے اوورا س کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ خدا کی پہلی مرضی ہے کہ تمہارا بیٹا تمہارا نام لیوا اور وارث بنے"۔

اس واقعہ کے سولہ سال بعد ادوراس ایک بار پھر پادری کے مطالعے کے کمرے میں کھڑا تھا۔

" تم پر عمر کا کوئی اثر نہیں پڑا ادوراس "۔ پادری نے اس سے کہا ادوراس ہمیشہ کی طرح تندرست اور بارعب نظر آرہا تھا۔

"اس لئے مجھے کوئی فکر نہیں "۔

اس پر پادری نے کچھ نہیں کہا اور پوچھا۔"ادھر کیسے آنا ہوا؟"

"میں اپنے بیٹے کے امتحان کا نتیجہ معلوم کرنے آیا ہوں"۔

"وہ ایک لائق اور متاثر کرنے والا لڑکا ہے"۔ پادری نے کہا۔

" میں آپ کو چرچ کے فنڈ کے لئے تب تک پیسے نہیں دوں گا جب تک یہ معلوم نہیں، ہو جاتا کہ امتحان میں میرے لڑکے کی کون سی پوزیشن ہے"۔

"اسے پہلی پوزیشن حاصل ہو گی"۔

" میں نے بھی یہی سنا ہے لیجیئے میری طرف سے عطئے کے طور سو ڈالر رکھ لیجئے"

" میں تمہارے لئے اور کیا کر سکتا ہوں؟ پادری نے.... اس کے چہرے پر نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"اور کچھ نہیں۔ شکریہ!"

آٹھ سال اور بیت گئے۔ ایک دن پادری کے مطالعے کے کمرے کے باہر لوگوں کا شور سنائی دیا۔ شور کرنے والے لوگوں کا سردار ادوراس تھا۔ وہ پادری کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

"آج اتنے لوگوں کے ساتھ کیسے"؟ پادری نے اس نے اس سے سوال کیا۔

" میرا بیٹا گڈ منڈ کی لڑکی کورین سے شادی کرنا چاہتا ہے میں چاہتا ہوں کہ یہ نیک کام آپ کے مبارک ہاتھوں سے انجام پائے"۔ ادوراس نے کہا۔ اس کا بیٹا ار کورین بھی بھیڑ میں کھڑے تھے۔

"کورین بھی اس گاؤں کی سب سے امیر لڑکی ہے"۔ پادری نے کہا۔ "اپنے باپ کی اکلوتی اولاد۔ تمہارے بیٹے کی طرح۔ خدا ان کی جوڑی تا قیامت سلامت رکھے"

"ہاں۔ سبھی ایسا ہی کہتے ہیں"۔ ادوراس نے اپنے سر کے بال میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

پادری کچھ دیر تک بہت سنجیدگی سے کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے بغیر کچھ بولے شادی کے رجسٹر میں فن اور کورین کے نام درج کر دیئے۔ فن اور کورین نے آگے بڑھ کر رجسٹر میں اپنے اپنے دستخط کر دیئے ادوراس نے اپنی جیب سے تین ڈالر نکالے اور چپکے سے پادری کی میز پر رکھ دیئے۔

"ایک ڈالر ہی کافی ہے"۔ پادری نے کہا۔

"اسے رکھ لیجئے پادری صاحب۔ فن میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میں اس کے سارے کام اچھی طرح کرنا چاہتا ہوں"۔

"یہ تیسری بار ہے ادوراس جب تم اپنے بیٹے کی وجہ سے چرچ میں آئے ہو"۔

"مجھے اپنی بقیہ زندگی اب اس کے سہارے ہی گزارنی ہے"۔ یہ کہتے ہوئے ادوراس نے اپنا ہیٹ اٹھایا اور رخصت ہونے سے قبل پادری سے اجازت طلب کی۔

پندرہ دن بعد دونوں باپ بیٹے شادی کے سلسلے میں ہونے والی دعوت کے انتظام میں کورین کے باپ کا ہاتھ بٹانے کی غرض سے ایک چھوٹی سی کشتی کھیتے ہوئے جھیل پار کر رہے تھے۔

"یہ کشتی اب پرانی ہو چکی ہے"۔ لڑکے نے اپنے باپ سے کہا اور اپنی گدی کو ٹھیک کرنے کے لئے کشتی کی سطح پر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت، لکڑی کے جس تختے پر وہ کھڑا تھا ٹوٹ گیا۔ فن نے اپنے ہاتھ ادھر ادھر پھیلائے مگر ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ وہ پانی میں ڈوب گیا۔

"پتوار کو مضبوطی سے پکڑلو"۔ باپ نے چیخ کر کہا اور اس نے پانی کے اندر جہاں پر فن ڈوب رہا تھا، پتوار کا چوڑا والا حصہ ڈال دیا۔ فن نے اسے پکڑنے کی دو تین

بار کوشش کی مگر اس مچھے کے ہاتھ پتوار سے دور ہی رہے۔ چند لمحوں بعد ادوراس کو فن کی سرخ آنکھیں اور تکلیف سے اکڑا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ پھر لمحے بھر میں وہ پانی کی سطح سے غائب ہو گیا۔

ادوراس کو اس پر یقین نہیں آیا۔ وہ کشتی کو پکڑے ہوئے بیٹھا رہا اور پانی کی سطح کے اس حصے کو گھورتا رہا جہاں اس کا بیٹا ابھی ابھی ڈوبا تھا۔ اسے اب بھی امید تھی کہ فن وہاں سے صحیح سلامت باہر نکل آئے گا پانی کی سطح پر کچھ بلبلے ابھرے پھر پانی کی سطح ایک بار پھر شیشے کی طرح ہو کر چمکنے لگی۔

لوگوں نے دیکھا کہ تین دن تک بغیر کچھ کھائے اور سوئے ہوئے ادوراس جھیل کے اس کونے کے اردگرد کشتی پر بیٹھ کر چکر لگاتا رہا۔ وہ اپنے لڑکے کی لاش کو ڈھونڈ رہا تھا۔ چوتھے دن صبح اسے فن کی لاش مل گئی اور اس نے اسے کندھے پر اٹھایا اور پہاڑی پر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

اس واقعے کے ایک سال بعد موسم سرما میں ایک گہری ہوتی ہوئی شام کو پادری نے اپنے کمرے کے باہر برآمدے میں کسی کے بھاری قدموں کی آہٹ سنی۔ پادری نے جب دروازہ کھولا تو ایک لمبا اور جھکا ہوا پیکر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے سر کے بال،، روئی کے مانند سفید ہو چلے تھے۔ پادری بہت دیر تک اسے غور سے دیکھتا رہا پھر اس نے اسے پہچان لیا۔ وہ ادوراس تھا۔

"اتنی رات گئے گھومنے نکلے ہو؟" پادری نے اس کے سامنے آکر کھڑے ہوتے ہوئے کہا"۔

"ہاں! بہت دیر ہو گئی ہے"۔ ادوراس ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

پادری بھی اپنی جگہ آ بیٹھا اور انتظار کرنے لگا۔ بہت دیر تک ادوراس کچھ نہیں بول پایا پھر اس نے کسی طرح کہا۔ "میں غریبوں کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے بیٹے کی روح کو ایصال ثواب کے لئے"۔ وہ اٹھا آگے بڑھا اور کچھ رقم میز پر پھیلا دی۔ پھر دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ پادری نے اس رقم کو گنا۔

"یہ تو بہت زیادہ ہے" ۔ پادری کے چہرے پر حیرت کی چمک ابھر آئی ۔ "یہ میری کل جائیداد کا نصف حصہ ہے جسے میں نے آج ہی فروخت کیا ہے" ۔

پادری کچھ دیر چپ چاپ بیٹھا رہا ۔ پھر اس نے ادوراس سے ہمدردی کے ساتھ پوچھا ۔ "تمہاری کیا خواہش ہے ادوراس ؟" ۔

"کوئی بہتر کام ۔ کوئی بھی ۔ لوگوں کی بھلائی کا کام" ۔

وہ دونوں کچھ دیر ویسے ہی بیٹھے رہے ادوراس کی نگاہیں نیچے جھکی ہوئی تھیں ۔ وہ مسلسل فرش کو گھور رہا تھا ۔ پادری کی نگاہیں ادوراس اس پر ٹکی ہوئی تھیں ۔

"خدا نے تمہارے بیٹے کو منتخب کیا تا کہ اس کی موت کے ذریعے سے تم لوگوں کا انتخاب کر سکو" پادری نے آخر کار ادوراس سے شفیق لہجے میں کہا ۔

"ہاں ! میں بھی ایسا ہی سوچتا ہوں" ۔ ادوراس اٹھ کھڑا ہوا ۔ جھک کر پادری کی تعظیم کی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا ۔

شنکر منچی پارتھسارتھی

(تیلگو)

بے رنگ زندگی

بھری دوپہر کو ایک بجے۔

سورج گرمی کے رنگ میں رنگا ہوا لال گولے کی طرح جل رہا تھا، اور نرسنگھلو اسی لال دھوپ میں رکشا چلا رہا تھا۔ اس کے سارے بدن سے پسینہ بہہ رہا تھا، اور اس کی کھدر کی بنیان پوری طرح گیلی ہو چکی تھی۔

"کیا بجا ہے بابو جی؟" رکشا چلاتے ہوئے اس نے اپنی سواری سے پوچھا۔

"ایک بجا ہے۔" سواری کا جواب ملا۔

تو اب اسے جھونپڑی پہنچنا چاہئے، ملی انتظار کر رہی ہو گی"۔ نرسنگھلو نے سوچا۔

نرسنگھلو، صبح سات بجے سید کی دوکان میں تھوڑی سی چائے پی کر رکشا پر بیٹھتا تھا۔ پھر دفتر اور اسکول جانے والوں کو پہنچا کر اکا دکا سواریوں کو دیکھتے ہوئے ایک بجے دن تک اپنی جھونپڑی میں پہنچ جاتا تھا۔ تب تک ملی شوہر کی گزشتہ روز کی آمدنی سے کنکی خرید کر پکاتی اور نرسنگھلو کا انتظار کرتی تھی۔ جو قسمت میں ہوتا وہی کھا کر دونوں تھوڑی دیر کے لئے بات چیت، ہنسی مذاق کر لیتے تھے، پھر میٹنی شو کے وقت تک اپنے رکشہ کے ساتھ نرسنگھلو سڑک پر آجاتا۔

نرسنگھلو نے لال تکون والے دفتر کے پاس رکشا روک دیا۔ جو آدمی رکشہ پر بیٹھا تھا پیسے دے کر چلا گیا اپنے چہرے کا پسینہ پوچھتے ہوئے نرسنگھلو نے ایک بار لال

ٹکون والے دفتر سے ملحق بورڈ کی طرف دیکھا۔ سیب جیسا چھوٹا بچہ منہ کھولے ہنس رہا تھا۔ اچانک نر سنگھلو کو ملی کی یاد آئی۔ کسی خیال نے ذہن میں انگڑائی لی۔ دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے اس نے رکشہ کو جھونپڑی کی طرف موڑ دیا۔

وہ سیدھا جھونپڑی پہنچا اور ماڑ پینے کے بعد بیڑی سلگا کر ملی سے پوچھا۔ "اری سن! کہتے ہیں جن کے پاؤں بھاری ہوتے ہیں انہیں کسی نہ کسی چیز کی چاہ ہوتی ہے اور نہ معلوم کیا کچھ کھانے کی خواہش ہوتی ہے۔ کیا تجھے کچھ محسوس نہیں ہوتا؟"

ملی یہ سنتے ہی شرم سے پانی پانی ہو گئی "۔جاؤ بھی ایسا نہیں کہتے "۔اس نے کہا

بیڑی کا کش لے کر نر سنگھلو نے پیار سے کہا۔ "شرمامت پگلی، کچھ چاہتی ہو تو بتا دے "۔

پل بھر کے لئے ملی نے نظریں اٹھا کر نر سنگھلو کے چہرے کو دیکھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے محض مذاق نہیں بلکہ اس کی محبت اور اپنائیت کے سبب کہہ رہا ہے وہ آہستہ آہستہ اٹھی اور نر سنگھلو کے قریب آکر محبت سے بولی۔

" سنو! مجھے ایک چیز چاہئے۔ لا دو گے؟"

" کیا چاہئے؟ "اس نے اشتیاق سے سوال کیا۔

لمحے بھر کو ملی جھجکی، پھر دھیمے سے بولی۔ "اے جی! تو سنو۔ مجھے کئی دنوں سے خواہش ہو رہی ہے کہ ان ناخنوں کو رنگ لگالوں۔ تم ناخنوں کے رنگ والی شیشی لے آؤ گے؟ "اس نے اپنے بڑھتے ہوئے ناخنوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نر سنگھلو یہ سن کر زور سے ہنسا۔ ہاتھ میں جو بیڑی تھی اسے اس نے دور پھینک دیا۔ پھر ملی کی طرف شرارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ارے پگلی وہ رنگ اور ڈھنگ ان پتلیوں کے لئے ہیں جن کی کوئی صورت نہیں ہوتی تیری جیسی عورت کے لئے یہ چیزیں نہیں ہیں "۔

ملی نے ناراضگی کے انداز میں منہ بنایا۔ یہی تو ہونا تھا۔ تم نے کہا مانگو جب

مانگا تو انکار کرتے ہو۔ اصل میں تمہیں مجھ سے محبت ہی نہیں "۔ اس نے مصنوعی غصے سے کہا۔

نرسنگھلو پھر ہنسا۔ "ایسی بات نہیں ملی۔ فرمائش تو پھل یا مٹھائی کی کرتی ہیں۔ ناخنوں کے رنگ کی فرمائش کچھ عجیب ہے"۔

ملی نے مزید غصہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "ہاں جی کچھ لوگوں کا پیٹ کھانے سے بھرتا ہے، مگر مجھ جیسی عورتوں کا فرمائشی چیزیں لا کر دے دینے سے ہی بھر جاتا ہے"۔

اس بار نرسنگھلو ہنسا نہیں۔ "ٹھیک ہے تو خرید لینا"۔ یہ کہہ کر وہ باہر آگیا۔

اس کے جانے کے بعد ملی مسکرائی۔ کہنے کو تو وہ کہہ گیا۔ کہ ٹھیک ہے لیکن وہ کیسے لا سکے گا یہ ملی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

" ناخن کے پالش کے کیا دام ہیں ؟ نرسنگھلو نے ایک دوکان میں جا کر دریافت کیا"۔ معمولی کی چار روپے اور عمدہ کی پانچ روپے۔ دوکاندار نے جواب دیا۔

وہ دن بھر کھٹ کر رکشا چلائے تو بھی رکشا کا کرایہ چھوڑ کر سات روپے سے زیادہ نہیں بچیں گے اس میں سے چائے اور بیڑی جیسے متفرق اخراجات نکال دیئے جائیں تو پانچ روپے بچیں گے۔ انہیں وہ کنگی خریدنے کے لئے ملی کو کیسے دے سکے گا؟ تو پھر ایسی صورت میں جس ملی نے اس کے کہنے پر ہی فرمائش کی تھی اس کی خواہش وہ کیسے پوری کرے؟

جتنے بھی دن گزریں حالت یہی رہے گی۔

اس شہر میں رکشا چلانے والے اچانک بڑھ گئے ہیں رکشا میں بیٹھنے والے اتنے سخی تو نہیں کہ اصل کرائے کا دوگنا دے دیں۔ آدھا روپیہ دینے کے لئے تو اسی بار سوچتے ہیں.... تو پھر ملی کی فرمائش وہ کیسے پوری کرے گا؟ اس طرح کی ادھیڑ بن میں پھڑ پھڑاتے ہوئے نرسنگھلو کو ایک موقع خود بخود مل گیا۔

بازو والی گلی میں رہنے والے کو دن ڈرمیا نام کے ایک وکیل صاحب نے دوسرے دن نرسنگھلو کے لئے بلاوا بھیجا اور اس کے آنے پر کہا۔ "آئندہ ہفتے میری بیٹی کی

شادی ہے، اس دن سویرے ٹھیک سات بجے رکشا لے آنا۔ رات تک ہمارے ساتھ رہنا ہوگا۔ کتنا لوگے؟"

نرسنگھلو وکیل صاحب کے بچوں کو اسکول لے جاتا تھا اور پھر واپس لاتا تھا۔ نہایت احترام کے ساتھ اس نے کہا۔ "آپ کی مرضی بابو جی۔ کیا میری محنت کو آپ نہیں جانتے؟"

"تو ٹھیک ہے۔ پندرہ روپے دیں گے۔ منظور ہے؟" نرسنگھلو کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

اس نے چاہا کہ کچھ اور زیادہ مانگے لیکن اگر انہوں نے انکار کر دیا تو یہ موقع بھی اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور تب.... تب اسے یہ موقع نہیں ملے گا کہ وہ ملی کی خواہش پوری کر سکے۔

"ٹھیک ہے بابو جی!" یہ کہہ کر وہ رکشہ کے ساتھ ہوا سے باتیں کرتا ہوا جھونپڑی پہنچا۔ اور ملی کو یہ بات بتا کر اعلان کیا۔ "وہ جو پیسے دیں گے اس کے وہ ناخن پالش خرید لے گا"۔

ملی کا کلی جیسا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

ہفتہ کا دن آگیا۔

نرسنگھلو ہر روز کی طرح رکشا لے کر نکل پڑا۔ چائے کی دوکان میں تھوڑی سی چائے پینے اور بیڑی کا ایک بنڈل خریدنے کے بعد وہ وکیل صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ اس وقت وہ نرسنگھلو کے نہ آنے سے ایسے گھبرا رہے تھے جیسے ہارا ہوا موکل فیس دیئے بغیر چلا گیا ہو نرسنگھلو کو دیکھتے ہی انہوں نے کہا۔ "آگئے۔ چلو چلو کافی دیر ہو گئی"۔

انہوں نے سامان سے رکشا بھر دیا اور خود بھی اس پر بیٹھ گئے۔ رکشا چل پڑا۔ اس وقت سے دو بجے دن تک نرسنگھلو اور اس کے رکشہ کو بالکل آرام نہیں ملا شادی میں آئے ہوئے رشتہ داروں نے جیسے کبھی رکشا دیکھا ہی نہیں تھا۔ چڑھ کر بیٹھ جاتے اور سڑکوں پر گھماتے رہتے، وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ کنٹریکٹ جو تھا۔

"جیسے میں کار، اور ہوائی جہاز کو دیکھتا ہوں" ویسے ہی یہ لوگ میرے رکشہ کو دیکھ رہے ہیں، نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑے ہیں یہ لوگ۔ اس نے دل ہی دل میں غصے سے سوچا۔

دوپہر کے دو بج گئے۔

شادی والے گھر میں لوگ کھانا کھا رہے تھے رکشا کو تھوڑا آرام ملا۔ نرسنگھلو کو زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کھانے کے لئے اپنی جھونپڑی پر چلا جائے یا وہ لوگ اسے کھانا دیں گے۔ بہت دیر تک وہ اسی کشمکش میں رہا لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔

"اب تک ملی بھی کھانا کھا چکی ہوگی"۔ صبح نکلتے ہوئے وہ یہ کہہ کر آیا تھا کہ وہ شادی والوں کے گھر ہی کھالے گا۔

"اب کوئی فائدہ نہیں۔ چل کر تھوڑا چائے ناشتہ کر آنا چاہئے"۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کھانے کا دور ختم ہو گیا۔ باراتی باہر نکلے اور اپنی توندوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آکر رکشا پر بیٹھ گئے۔ "جن والے لے چلو"۔

جن والے اور شادی والے گھر کے درمیان نرسنگھلو کا چکر پھر شروع ہو گیا۔ باراتیوں میں ایک موٹی چلاچی جی (جن کا نام اور دولھا کے ساتھ ان کا رشتہ نرسنگھلو بالکل نہیں جانتا تھا) رکشا میں بہت گھوم رہی تھیں، ان کی اولادوں کو پہنچانے کے لئے ہی تین چکر لگانے پڑے۔

ذرا بچی کو رکشا میں بٹھا کر گھما لاؤ۔ میں ابھی ساڑھی بدل کر آتی ہوں۔ "چھتیسویں بار رکشہ سے اتر کر موٹی چلاچی جی نے بچی کو نرسنگھلو کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔

"ماں جی! اس کام کو میرا سلام"۔ اس نے یہ کہہ کر چلے جانا چاہا۔ لیکن اسے ملی کی یاد آئی۔ اس کی فرمائش کی یاد آئی۔ اس نے چپ چاپ بچی کو لے کر رکشا میں بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ اس طرح رات کے دس بجے تک بغیر آرام کے وہ رکشا چلاتا رہا۔

اس کے سارے جسم میں درد ہو رہا تھا۔ صبح کی چائے کے بعد وہ پانی کے دو گھونٹ بھی نہیں پی سکا تھا۔ چلاجی جی کے خاندان کو شادی والے گھر لے جاتے ہوئے نرسنگھلو کو ایسا لگا کہ اسے چکر آجائے گا۔ انہیں پہنچا کر اس نے آخری بیڑی سلگائی۔ بیڑی کا ایک کش بھی نہیں کھینچا تھا کہ چلاجی جی آندھی کی طرح واپس آگئیں۔ "ارے نرسنگھلو ذرا دیکھ، لڑکی کی پازیب رکشا میں تو نہیں رہ گئی؟" انہوں نے کہا۔

نرسنگھلو نے ایک بار رکشا میں سیٹ کے نیچے اور چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

"نہیں جی"۔

"ہے بھگوان! ۔یہ کیسے؟ جب میں رکشا میں بیٹھی، اس وقت تو وہ تھی، اتر کر اندر گئی تو دکھائی نہیں دے رہی ٹھیک سے دیکھ"۔ چلاجی جی چلا رہی تھیں اور نرسنگھلو بار بار کہہ رہا تھا "رکشا میں تو نہیں گری صاحب۔"

چاروں طرف جمع ہو جانے والے لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ شور و غل کی آواز سن کر کونڈورامیا باہر آگئے۔ انہوں نے لوگوں کی بات سنی، پھر نرسنگھلو کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس طرح میرا منہ تک رہا ہے، اچھی طرح ڈھونڈ"۔

پھر انہوں نے اپنے دل میں سوچا۔ "سارے معاملات ٹھیک ٹھاک بغیر کسی شکایت کے طے ہو گئے۔ اب کہیں اس چھوٹی سی بات کے لئے بے عزت نہ ہونا پڑے"۔

"جی صاحب دیکھ چکا ہوں، رکشا میں تو نہیں گری ہے"۔ نرمی کے ساتھ نرسنگھلو نے کہا۔

"اے بیوقوف! رکشا میں نہیں تو اور کہاں گری ہے، اچھی طرح دیکھ"۔

"نہیں صاحب۔ ہر جگہ ڈھونڈ لیا تبھی تو کہہ رہا ہوں رکشا میں تو گری نہیں ہے"۔

"نہیں بھائی صاحب۔ میں جب رکشا میں آرہی تھی تب وہ تھی۔ اتر کر اندر آئی تو پھر وہ نظر نہیں آئی چلاجی نے کہا۔

کونڈورمیا نے نرسنگھلو کی طرف دیکھا۔

"مجھے نہیں معلوم صاحب۔ سچ کہتا ہوں، مجھے بالکل نہیں معلوم"۔ نرسنگھلو نے ڈرتے ہوئے کہا۔

اس کی گھبراہٹ دیکھ کر وکیل صاحب کے شبہ کو اور تقویت ہوئی۔ وہ غصے سے کانپنے لگے۔ باراتیوں میں سے کسی نے کہا۔ "دو ہاتھ لگاؤ۔ کم بخت خود ہی بتا دے گا"۔

کونڈرامیا نے اپنی آستین چڑھالی۔ "ابے پہچان کا آدمی سمجھ کر بلایا تو تو نے یہ کیا کر دیا۔ بتا کہاں چھپایا ہے"۔ نرسنگھلو کی قمیص کو دونوں ہاتھوں سے کھینچتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"بابوجی! سچ مچ مجھے نہیں معلوم۔ رکشا میں نہیں گری صاحب"۔ ڈر سے کانپتے ہوئے اس نے کہا۔

"راسکل! بتا کہاں چھپا رکھی ہے؟" انہوں نے اسے زور سے پیچھے دھکیل دیا۔ نرسنگھلو پنڈال کے کھمبے سے جا ٹکرایا اور گر گیا۔ موقع پا کر ہر شخص نے ایک ایک لات جمائی۔

"مجھے نہیں معلوم صاحب"۔ نرسنگھلو نے روتے ہوئے کہا۔

اسی وقت موتی چلاچی کو یاد آیا کہ تھوڑی دیر پہلے انہوں نے لڑکی کے پاؤں سے پازیب اتار کر اپنی ساڑھی کے آنچل میں باندھ لی تھی۔ اسی لئے ساڑھی کے آنچل کو تمام لوگوں کی نظروں سے بچاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

جانے دو۔ مارو گولی کمبخت پازیب کو۔ اس نے گناہ کیا ہے تو اسے اس کی سزا مل گئی"۔

کونڈرامیا پھر غصے میں آگے بڑھے "۔ جا جا چور کے بچے۔ اب اپنا منہ مجھے مت دکھانا"۔

لوگ آہستہ آہستہ منتشر ہو گئے۔

چلاجی، اور وکیل صاحب بھی اندر چلے گئے نرسنگھلو کھوئی ہوئی طاقت کو جمع کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آنکھیں پونچھ کر نفرت سے شادی والے گھر کی طرف دیکھا۔جہاں چوٹ لگی تھی وہاں پر تھوڑا درد محسوس ہوا پھر بھی اس کی پروا کئے بغیر وہ باہر آیا، اور رکشا لے کر جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔

عزت گئی۔پیسہ گیا۔جسم کی توانائی گئی۔سب کچھ گیا۔لیکن ایک ہی بات کا اسے اطمینان تھا کہ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔وہ چور نہیں تھا۔اس کے جی میں آئی کہ وہ واپس جا کر سبھوں سے کہہ دے کہ بابوجی میں چور نہیں ہوں۔اگر چوری کی عادت ہوتی تو میں بھی رکشا پر بیٹھتا۔رکشا نہیں چلاتا۔مگر اس کے جسم میں طاقت نہیں تھی۔اسے چکر آ رہا تھا۔جھونپڑی پہنچ کر اس نے رکشا ایک طرف کھڑا کر دیا۔اور اندر جا کر کھٹیا پر ڈھیر ہو گیا۔ملی اس کے پاس آئی۔"تھک گئے ہو؟ میری خاطر تم اتنی محنت کر رہے ہو نا؟" اس نے اپنی انگلیاں اس کے بالوں میں پھنسا دیں، لیکن فوراً ہی اس نے اپنا ہاتھ ایسے پیچھے ہٹا لیا جیسے اس نے سانپ چھو لیا ہو۔

اس کے ہاتھ سے گرم اور چکنی سی چیز چھو گئی تھی، چراغ لا کر اس نے دیکھا۔وہ اس کے شوہر کا خون تھا۔

اس کے منہ سے بے ساختہ ایک چیخ نکل گئی۔

لیٹے ہوئے نرسنگھلو نے آنکھیں کھول کر دیکھا ملگجی روشنی میں اپنے خون سے رنگے ناخن دیکھ کر اسے ایسا لگا جیسے ان پر پالش لگا دی گئی ہو۔لاچاری اور کمزوری کے ساتھ وہ ہنسا اور پھر آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔اس طرح لیٹے ہوئے اس کے چہرے پر کوئی رنگ نہیں ابھر رہا تھا۔ٹھیک اپنی بے رنگ زندگی کی طرح!

کملیشور

(ہندی)

بیان

اس سے زیادہ میں کیا بتا سکتی ہوں۔ایک مرد اور عورت کے درمیان جو کچھ ہوتا ہے وہ ہوتا ہے لیکن تعلقات کی بنیاد صرف اسی پر نہیں ہوتی.... جی! میں بہک نہیں رہی ہوں۔ سننا ہے تو پوری بات سنیئے۔ ٹکڑے ٹکڑے باتوں سے میرا جی بہت گھبراتا ہے۔اگر آپ صرف میری شادی سے کچھ پہلے کی کچھ درمیان کی اور کچھ آخر کی باتیں جاننا چاہتے ہیں تو میں مشین کی طرح بتاتی جاؤں گی کیونکہ مجھے بتانی ہی پڑیں گی۔خاموش رہ کر میں نہ آپ کے قانون سے بچ سکتی ہوں نہ لوگوں کی حقارت سے اور نہ اپنی بچی کے سوالوں سے....

میری زندگی کے سوا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔جو کچھ ہے وہ میری زندگی میں بکھرا ہوا ہے۔وہ لمحے جنہیں میں کبھی بکھرنے نہیں دیتی وہ بھی اب یادوں سے محو ہو گئے ہیں یا محو ہو رہے ہیں۔اب مجھے چھپانا کیا ہے۔کس کے لئے اور کیوں؟

جی ہاں! یہ سچ ہے۔۔شادی سے پہلے میں بشن کو چاہتی تھی۔لیکن اس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟ جھوٹ اور سچ کے قلابے مت ملایئے۔میں بھگوان کا واسطہ دے کر کہتی ہوں اس کا کوئی تعلق اس حادثے سے نہیں ہے۔ بھگوان کے لئے مجھے ذلیل مت کیجئے۔مجھے نہیں معلوم بشن اب کہاں ہے۔یہ تو ۲۲ سال پہلے کی بات ہے بلکہ اس سے بھی ایک آدھ سال پہلے کی۔نہیں ہم نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔میری

شادی کے وقت وہ موجود بھی نہیں تھا۔ اس نے کوئی دھمکی نہیں دی تھی۔ بشن ایسا لڑکا نہیں تھا۔ وہ بہت سنجیدہ سمجھدار اور ذہین تھا....

جی! غلط مطلب کیوں نکالتے ہیں؟ ان الفاظ سے آپ سمجھتے ہیں کہ میں آج بھی اسے چاہتی ہوں۔ آپ جو چاہیں کہہ لیجئے۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ لیکن مجھے یہ حق نہیں کہ میں اچھے کو اچھا اور برے کو برا کہہ سکوں؟۔

نہیں۔ میری بشن سے بس اتنی ہی محبت تھی جتنی کہ بائیس چوبیس برس پہلے کوئی بھی لڑکی کسی بھی لڑکے سے کر سکتی تھی۔ میں کب کہتی ہوں کہ وہ مجھ سے نہیں ملا.... لیکن میرا اعتبار کیجئے.... شادی کے بعد مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں گیا....

دیکھئے۔ پھر غلط بات کہی جا رہی ہے۔ میں اپنی روح کی تمام گہرائیوں سے کہتی ہوں کہ میرے شوہر نے مجھے بے انتہا پیار کیا۔ انہوں نے مجھے کبھی پریشان نہیں کیا۔ میں نے۔؟ میں نے کیا کیا، اس کی گواہی تو صرف وہ دے سکتے تھے۔ اگر وہ ہوتے۔

یہ سراسر غلط ہے.... آپ لوگ، غلط اور بے کار سوالوں سے صحیح نتیجے تک کیسے پہنچیں گے۔ ان فضول باتوں سے آپ ان کی موت کا سبب نہیں معلوم کر سکتے۔ شادی سے پہلے کا۔ بادل کے ٹکڑے کی مانند تیر کر گزرا ہوا عشق.... اس عشق کی سیاہ پرچھائیاں.... سب بہت معمولی باتیں ہیں۔ ان سے کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا۔

ان کے ساتھ میری آخری رات؟ اگر کہیں تو اس طرح بتا دوں کہ آپ کا اندھا اور بہرا قانون کسی نتیجے تک پہنچ سکے۔ لیکن اس آخری رات میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح ہماری وہ رات بہت معمولی تھی۔ ایک ایسی رات جو اوسط آدمی کی رات ہو سکتی ہے....

میں نے کوئی طعنہ نہیں دیا تھا۔ وہ غصے میں قطعی نہیں تھے ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو سمجھا لیتے تھے۔ گزشتہ کئی برسوں سے ہماری راتیں یوں ہی گزرتی تھیں۔ ہمارے پاس اور تھا ہی کیا سوائے ایک دوسرے کے.... سوا پریشانیوں کے۔

بچی؟ وہ ہمارے پاس ایک چھوٹے پلنگ پر سوتی تھی.... جی صرف دو کمرے ہیں

ایک کمرے بیٹھک کا کام دیتا ہے۔ شام کو وہ گھومنے گئے تھے۔ کبھی کبھی وہ دیر سے بھی لوٹتے تھے۔ لیکن اس دن وقت سے لوٹ آئے تھے۔ بچی کے لئے چار ٹافیاں بھی لائے تھے۔ دوا انہوں نے اسے دیدی تھیں۔ دو دوسرے دن کے لئے کاغذ کے نیچے رکھ دی تھیں۔

جی! اس سے پہلے وہ ایک سرکاری رسالے میں تھے۔

جی ہاں! فوٹو گرافر ہی تھے۔

انہوں نے اپنا پیشہ کبھی نہیں بدلا۔ انہیں یقین تھا کہ ایک دن وہ بہت بڑے فوٹو گرافر بنیں گے۔ ان کی زندگی کا یہی مقصد تھا کبھی نہیں۔ انہوں نے کبھی ماڈل فوٹو گرافی نہیں کی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو بھی ہمارے تعلقات کے شیشے میں کوئی بال نہ آتا۔ ان کے لیے دنیا میں سب سے حسین عورت میں ہی تھی۔ آپ مسکرا لیجئے آپ کو میں بہت معمولی ہی لگوں گی۔ مگر آپ مجھے میرے شوہر کی نظروں سے دیکھنے کی کوشش کیجئے۔ تبھی آپ میری بات سمجھ پائیں گے۔ کیمرہ اور میں.... بس ان کے لئے دو چیزیں تھیں یا پھر ہماری بچی۔

کبھی کبھی میں ان کے سینے پر سر رکھ لیتی تھی تو ان کی انگلیاں میری کنپٹیوں پر اس طرح تھرتھراتی تھیں جیسے کسی اوجھل ہو جانے والے لمحے کو پکڑنے کے لئے کیمرہ پر کانپتی تھیں۔ میری انگلیوں کے پوروں کو وہ ایسے دباتے رہتے تھے جیسے شٹر دبا رہے ہوں.... ہماری محبت کے سب سے حسین لمحے یہی ہوتے تھے۔ ٹھیک کہتے ہیں آپ نجی باتوں سے آپ کو کیا لینا دینا۔ لیکن میں سمجھ نہیں پاتی کہ پھر آپ اسباب کا پتہ کس طرح چلائیں گے۔ میری زندگی کی دھندلی روشنی سے ہی آپ کو اسباب تلاش کرنے میں سہولت رہے گی۔ اگر یہ لمحے بھی نہ ہوتے تو میری زندگی میں اور تھا ہی کیا۔؟ بائیس برسوں کا ایک ویران سفر۔

خیر میں چپ ہو جاتی ہوں۔ لیکن آپ ہی تو کہتے ہیں کہ ان باتوں کو رہنے دیجئے ان کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ مجھ سے بولنے کو کہیں گے تو میں بولوں گی۔

آپ چاہیں تو ٹکڑے ٹکڑے سوال پوچھیئے۔

جی ہاں سرکاری رسالے سے بحیثیت فوٹو گرافر وابستہ ہونے سے پہلے وہ سرکاری پریس انفارمیشن بیورو میں تھے سی ہاں فوٹو گرافر ہی تھے۔ میں نے کہا نا کہ انھوں نے اپنا پیشہ کبھی نہیں بدلا شروع شروع میں جب وہ مجھے آنکھ دبا کر دیکھتے تھے تو مجھے بڑی گد گدی ہوتی تھی یہ شادی کے بعد ابتدائی دنوں کی بات ہے مجھے گد گدی اس لئے ہوتی تھی کہ ایک آنکھ دبا کر دیکھنا.... آپ جانتے ہی ہیں مجھے اب بھی ہنسی آتی ہے مگر یہ ان کی عادت بن گئی تھی۔

جی ہاں! بہت ہی بچگانہ معلوم ہوتی ہے یہ حرکت.... مگر کیمرے کی وجہ سے وہ مجبور تھے۔ بعد میں مجھے ان کی اس عادت سے کبھی کبھی چڑ ہوتی تھی۔ لیکن پھر کچھ دنوں بعد میں نے جانا کہ جب بھی ایک آنکھ دبا کر وہ مجھے دیکھتے تھے تو صرف مجھے ہی دیکھ رہے ہوتے تھے۔ میں معافی چاہتی ہوں کیا کروں گھوم پھر کر ان ہی لمحوں تک پہنچ جاتی ہوں۔ دکھ تو اب اٹھانا ہی ہے۔ پریس انفارمیشن بیورو میں وہ تقریباً پانچ سال تھے۔

تقریباً چھ سال سرکاری رسالے میں۔

چار ساڑھے چار سال ایک اشتہاری کمپنی میں۔

جی ہاں! انہوں نے تھک ہار کر نوکری چھوڑ دی تھی۔ یا یوں کہیئے کہ ان سے چھڑوا دی گئی تھی انہوں نے کبھی نامناسب یا ناجائز کام نہیں کیا تھا۔

ہاں یہ سب معلومات تو آپ کے پاس ہوں گی۔ سرکاری نوکری کی رپورٹ بھی حکومت سے آئی ہوگی۔ ٹھیک ہے ان کی دفتری زندگی کے بارے میں مجھے زیادہ معلوم بھی نہیں سوائے اس کے کہ شادی کے بعد شروع شروع کے سالوں میں وہ بہت پرجوش رہتے تھے....

جی! تصویر کے معاملے میں۔ تصویریں اور کیسی؟ وہ سرکاری فوٹو گرافر تھے پندرہ اگست سالانہ دعوتیں، غیر ملکی مہمان، لال قلعے میں استقبالئے، شاہی سواری اور افتتاحی تقاریب۔

.... انہی سب کی تصویریں، ہوتی تھیں۔ پھر جس سال ۲۶ جنوری کا جشن شروع ہوا تب سے ضرور کچھ لڑکیوں وڑکیوں کی تصویریں بھی لینے لگے تھے۔ لوک ناچ کی نیوی کے بینڈ کی۔ راشٹرپتی کی سواری اور سلامی کی طرح طرح کی تصویریں ہوتی تھیں۔

ایک بات اور غور کرنے کی ہے۔ جب وہ سرکاری رسالے سے وابستہ ہو گئے تو لہلہاتی کھیتیوں، بجلی گھروں، فیکٹریوں، ملوں، نئی ریلوے لائنوں، پلوں اور اسکولوں وغیرہ کی تصویریں اتارتے تھے وہ بہت خوش ہوتے تھے، کہتے تھے کہ۔ "آزادی کا یہی سکھ ہے"۔ لیکن چند برسوں بعد ان کی یہ خوشی پتہ نہیں کہاں کھو گئی تھی۔ ایک بار کہنے لگے۔ "ان تصویروں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میں خود کہیں اندر سے چھوٹا پڑتا جا رہا ہوں۔ شاید کچھ دنوں بعد میں کسی سے یہ بھی نہیں کہہ پاؤں گا کہ تصویریں سچ ہوتی ہیں"۔

جی ہاں! اس دن پہلی بار میں نے ان کی آنکھیں بے حد سرخ دیکھی تھیں لگتا تھا جیسے ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہو۔ میں نے ترپھلا کا شروع کر دیا تھا۔ پر ان کی آنکھوں کی سرخی نہیں گئی۔

انہی دنوں ایک واقعہ ہوا تھا۔ تھر کے ریگستان کو روکنے کے سلسلے میں کسی وزیر نے کوئی بیان دیا تھا۔ شاید یہ کہا تھا کہ میلوں جنگل لگا کر ریگستان کا پورب کی طرف بڑھنا روک دیا گیا ہے وہ اس جنگل کی جو تصویریں لائے تھے اس میں جنگل کہیں نہیں تھا۔ ریگستان ہی ریگستان تھا درخت لگائے ضرور گئے تھے مگر وہ سب سوکھ گئے تھے غلطی سے وہ تصویریں چھپ گئی تھیں۔ حزب اختلاف کے کسی رکن نے ان تصویروں کا حوالہ دے کر مصیبت کھڑی کر دی تھی۔ یہ سب شاید لوک سبھا میں ہی ہوا تھا۔ یہ صاحب کا بیان ان تصویروں سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ آدمی سے غلطی ہو جاتی ہے ان سے بھی ہو گئی تھی اور اس غلطی پر انہیں بہت ڈانٹ ڈپٹ پھٹکار کی گئی تھی ان دنوں وہ بہت پریشان تھے۔ ان کا وہاں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ تب میں نے ان کی آنکھوں سے خون کا پہلا قطرہ گرتے ہوئے دیکھا تھا رات بھر وہ تڑپتے رہے تھے صبح اٹھے

تو ان کا تکیہ خون کے قطروں سے سرخ تھا۔

جی ہاں! خون۔ میں نے بھی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا نہ کبھی سنا تھا۔ مگر یہ ہوا تھا۔ ہمارے گھر کی حالت خستہ ہو گئی تھی۔

جی ہاں! اسی کے بعد وہ ملازمت سے الگ ہو گئے تھے۔ ایک طرح سے مجبوراً انہیں علیحدہ ہونا پڑا تھا۔ تب انہوں نے ایک اشتہاری کمپنی میں نوکری کر لی تھی۔ دو تین گھنٹے کے لئے جاتے تھے کام کیا ایک بہانہ تھا۔ بہت مشکل سے گرہستی چلتی تھی تبھی بچی پیدا ہو گئی۔

بچی کے آنے سے ہم کچھ دنوں کے لئے تازہ ہو گئے تھے۔ نہیں۔ انہوں نے شراب کبھی نہیں پی۔ اشتہاری کمپنی میں بھی نہیں۔

کسی ماڈل واڈل کو لے کر وہ کبھی گھر نہیں آئے۔

جی ہاں! کبھی گھر سے باہر نہیں رہے۔ ہر رات گھر ہی پر گزری۔

جی نہیں! قسمت کو کبھی انہوں نے برا بھلا نہیں کہا۔ بہت اچھی طرح پیش آئے تھے۔

تصویریں؟ کوئی چار چھ ہزار ہوں گی۔ مگر سب سرکاری تصویریں ہیں۔

ہاں! وہ بہت تکلیف کے دن تھے۔ دو سو روپے ملتے تھے۔

جی بالکل! انہی دنوں مجھے نوکری کرنی پڑی۔

اسکول میں

منیجر کبھی کبھی آتے تھے۔

انہوں نے کبھی منع نہیں کیا۔

جی ہاں! کبھی کبھی وہ پہنچانے جاتے تھے۔

بچی انہی کے پاس رہتی تھی۔ وہ زیادہ تر گھر پر ہی رہتے تھے۔

جی نہیں! اشتہاری کمپنی کی نوکری ختم ہو جانے کے بعد۔

پھر انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا ادھر ادھر اخباروں کو تصویریں بھیجتے تھے

گھر کے باتھ روم میں ڈارک روم بنالیا تھا۔بچی کی بھی بہت سی تصویریں لی تھیں ۔گھر کا خرچ میری نوکری سے نکلتا تھا۔

بھگوان کے لئے مجھے ذلیل مت کیجئے۔میں منیجر کے گھر جاتی تھی ۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ.... میں یہاں بھی تو حاضر ہوئی ہوں ۔

آپ کہتے ہیں تو اپنے اس جملے کے لئے معافی مانگ لیتی ہوں ۔کیا کروں ۔دل دکھتا ہے تو یہی سب منہ سے نکلتا ہے سچ! مجھے معاف کیا جائے ۔میں اپنا جملہ واپس لیتی ہوں ۔

میری عمر اس وقت.... اب اڑتیس سال ہے اس وقت بتیس رہی ہو گی ۔

منیجر صاحب ؟ ۔وہ ساٹھ کے قریب تھے ۔ہاں کہا تھا.... ایک بار.... میں نے انہیں بتا بھی دیا تھا کہ منیجر تمہارا صبح شام اسکول میں آنا پسند نہیں کرتے ۔لڑکیوں کا اسکول ہے اس لئے ۔شاید انہیں کچھ برا لگا ہو ۔ممکن ہے ۔

میں پھر آپ سے کہتی ہوں ۔ان باتوں پر مت جائیے ۔یہ وجوہ قطعی نہیں ہیں ۔ قصے کہانیوں کی باتیں اور ہوتی ہیں یہ میری زندگی کی حقیقتیں ہیں ۔اس طرح مذاق مت اڑائیے میرے اچھے دنوں کو گندا مت کیجئے۔تکلیفوں کے دن سہی ۔پر ہم اس کے عادی ہو گئے تھے ۔ہمارے لئے وہی اچھے دن تھے میرا عاشق.... یا منیجر.... یا وہ ایڈیٹر جو بعد میں ان کے ساتھ میرے گھر آنے لگا تھا ۔وہ سب اس کام کاج کی دنیا میں سبھوں سے ٹکراتے ہیں ۔ کہیں وہ وکیل دوست اور افسر ہو سکتے ہیں ۔ کہیں ڈاکٹر ٹھیکیدار اور انجینئر ہو سکتے ہیں.... لوگ تو ایسے ہی ہوتے ہیں.... وہ تین یا چار یا دس ہو سکتے ہیں لیکن اس سے آپ کیا مطلب نکالنا چاہتے ہیں ؟ زندگی اور موت کے بارے میں نتیجہ ان معمولی باتوں سے نکل ئے گا ؟ اوہ! میں معافی چاہتی ہوں ۔

ایڈیٹر ؟.... وہ ایک ایسے ہی معمولی اخبار کا تھا اپنے کام کے سلسلے میں ہی اس سے ان کی جان پہچان ہوتی تھی ۔

جی! گرمیوں کی تعطیل کی تنخواہ اسکول سے نہیں ملتی تھی ۔ چھٹیوں میں ہمیں

نوکری سے ہٹا دیا جاتا تھا۔ سیشن شروع ہونے پر پھر رکھ لیا جاتا تھا۔ چھٹی کے ان دو مہینوں میں ہماری حالت بہت خراب ہو جاتی تھی۔

یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ اس ایڈیٹر کی وجہ سے میں نے نوکری چھوڑی۔ اس ایڈیٹر کا کوئی جھگڑا منیجر صاحب سے نہیں ہوا تھا میری وجہ سے بالکل نہیں۔ میں کیوں وجہ بنتی ان کے جھگڑے کی۔ وہ ایڈیٹر ہی ایسا تھا۔ اس کے اخبار سے سب گھبراتے تھے جھگڑے کا سبب وہ اخبار تھا۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں.... میرے بے قصور شوہر پر الزام مت لگایئے۔ میں جانتی ہوں آخر میں یہی الزام گھوم کر مجھ پر آئے گا.... میری بھری پری زندگی کے بخیئے ادھیڑے گا۔ میں خوب جانتی ہوں آپ لوگ مجھے کہاں دھکیل رہے ہیں کیا قانون کا کام صرف ثبوت اکٹھے کر کے کسی کو ذلیل کر دینا ہے؟۔ میں اپنے شوہر کی موت کی ذمہ دار کیسے ہو سکتی ہوں؟ آپ مجھے کانٹوں میں کیوں گھسیٹ رہے ہیں؟ جی ہاں! اس ایڈیٹر سے میرے شوہر کی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ ٹھیک ہے۔ آپ لفظ خاصی کو نوٹ کر لینا چاہتے ہیں، ضرور کر لیجئے مگر لفظوں کے ذریعہ آپ صداقت تک نہیں پہنچیں گے۔ صداقت کا انحصار بہت سی باتوں پر ہوتا ہے۔ شوہر کے دکھوں یا اس کے سکھوں کا سبب صرف بیوی نہیں ہوتی۔ یہ تصور بالکل غلط ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو بے انتہا چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بے نیاز ہوتے ہیں.... جڑے ہوئے ہونے کے باوجود الگ ہوتے ہیں.... پانی کی لہروں کی مانند۔

جی نہیں! میں فلسفہ نہیں پڑھاتی۔

جی نہیں! میں تقریر نہیں کروں گی۔ صرف واقعہ بیان کرتی جاؤں گی۔

خاصی دوستی؟ یہ دوستی ضرورت پر بھی ٹکی ہو سکتی ہے ہاں! وہ ایڈیٹر گھر پر کھانا کھانے بھی آتا تھا۔ میرے شوہر ہی اسے بلاتے تھے۔ میں اس کے ساتھ کہیں نہیں جاتی تھی اس کی نظروں میں بھی کوئی خاص آلودگی مجھے نہیں معلوم ہوتی تھی۔ جسے آپ شاید آلودگی کہنا چاہیں گے وہ سب کی نظروں میں ہوتی ہے۔ اسے آپ مرد اور عورت کے درمیان کشش کا نام دے سکتے ہیں اور اس کشش کو اگر گندا یا برا نہ مانا جائے تو یہ

بڑی معمولی سی چیز ہے۔اپنے کو شیشے میں دیکھتے رہنے کی طرح ہر مرد ہر عورت کے آئینے میں خود کو دیکھتا ہے۔ضروری نہیں کہ اس میں عمر یا تعلقات کا ہاتھ ہو۔

یہ خبر آپ کو غلط دی گئی ہے۔چھٹیاں ختم ہونے کے بعد مجھے اسکول میں پھر رکھ لیا گیا تھا۔جی نہیں۔میں نے ایڈیٹر اور منیجر کے جھگڑے کی وجہ سے نوکری نہیں چھوڑی۔یہ سراسر غلط ہے۔

جی! اس کے اخبار میں اسکینڈل قسم کی رپورٹیں چھپا کرتی ہیں۔ایڈیٹر نے منیجر سے متعلق کوئی رپورٹ نہ تو لکھی تھی نہ چھاپی تھی۔اس نے بلیک میل نہیں کیا تھا۔یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ میرے شوہر نے کسی طرح کا سمجھوتا کر لیا تھا۔آپ ان کی موت کے اصل اسباب کو اتنی چھوٹی اور بے ہودہ باتوں سے کیوں جوڑ رہے ہیں؟ اگر آپ سمجھ سکیں تو میں ان کے بارے میں کچھ بیان کروں۔میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ان کی آنکھیں لال رہنے لگی تھیں۔غلط تصویریں چھپ جانے کے بعد ان کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اسے وہ برداشت نہیں کر پائے تھے۔اپنے کام پر سے ان کا یقین اٹھ گیا تھا۔آپ سوچ سکتے ہیں کہ جب آدمی کا یقین اپنے کام پر سے اٹھ جائے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔وہ تصویریں جو انہیں یقین عطا کرتی تھیں یکایک ان کے یقین کو توڑ گئی تھیں وہ وہی کہہ سکتے تھے جو دوسرے چاہتے تھے۔اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد ان کی آنکھوں سے خون کے قطرے پہلی بار گرے تھے۔آپ چاہتے ہیں تو آنسو کہہ لیجئے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔میں قطعی بڑھا چڑھا کر نہیں کہہ رہی۔سچ مچ وہ خون کے قطرے تھے۔

خیر.... ان دنوں میں کام پر جانے لگی تھی وہ گھر میں بچی کے ساتھ وقت گزارا کرتے تھے۔ان دن اتوار تھا۔انہوں نے بچی کو پڑوس میں کھیلنے کو بھیج دیا تھا۔نہیں جھگڑے کی کوئی بات نہیں تھی۔اس کے برعکس اس دن وہ بہت پیار میں بھرے ہوئے تھے۔بہت دنوں بعد انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر انگلیوں کو شرٹ کی طرح دبایا تھا۔وہ کیمرہ لئے بیٹھے تھے۔پھر انہوں نے مجھے وائل کی باریک ساڑھی پہننے کو کہا تھا۔مجھے طرح طرح سے بٹھایا اور لٹایا تھا اور تصویریں لی تھیں۔اس وقت ان کی

آنکھیں پہلے کی طرح کانپ رہی تھیں۔ میں سمجھ گئی تھی وہ صرف مجھے دیکھ رہے تھے اس وقت جب وہ اپنے آپ میں ڈوبے ہوئے تھے تب بھی آٹھ دس بار ان کی آنکھوں سے خون کے قطرے ٹپکے تھے انوں نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ خود بھی بے طرح تھک گئے تھے۔ اس کے بعد وہ بستر پر لیٹ گئے تھے اور چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے تھے۔ میں کپڑے بدل کر انہیں چائے دینے آئی تو ان کی آنکھوں میں خون ڈبڈبا رہا تھا۔ اس وقت مجھے ڈر بھی لگا تھا کہ کہیں اگر انہوں نے پیار سے دیکھنے کے لئے آنکھ جھپکائی تو ڈبڈباتا ہوا خون بہہ نکلے گا۔ چائے میں نے ان کے سرہانے تپائی پر رکھ دی تھی۔ وہ وہیں رکھی رکھی ٹھنڈی ہو گئی۔ کھانا کھاتے وقت وہ کہنے لگے کہ کچھ کمائی ہو جائے تو ایک ٹیلی لنس خرید لوں تاکہ بازار کے مطابق کام کر سکوں۔ کھاتے وقت وہ اسٹرنیڈ، بسٹن، اسمتھ، کاشی ناتھ وغیرہ کے نام برابر لے رہے تھے۔

نہیں، نہیں۔ غلط مت سمجھئے۔ یہ میرے دوستوں یا چاہنے والوں کے نام نہیں ہیں۔ آپ لوگ ہمیشہ غلط رشتے جوڑتے ہیں۔ ہمیشہ آدمی کے وجود پر شک کرتے ہیں۔ وجود؟ یہ آدمی کی اپنی زندگی کے قانون کا لفظ ہے۔ یہ آپ کی کتابوں میں نہیں ملے گا۔ خیر شام کو ہی انہوں نے فلم ڈیولپ کر کے پرنٹ بنا لئے تھے۔ پرنٹ دیکھتے ہوئے وہ بہت شرمندہ تھے۔ مجھے نہیں معلوم انھیں کیا ہوا تھا۔ میری تصویریں لئے وہ آئینے کے سامنے کھڑے تھے اور اپنا چہرہ اس میں دیکھتے جاتے تھے۔ بس اسی وقت ان کی آنکھوں سے خون کی دھار رسنے لگی تھی۔ اس شام سے جو خون ٹپکنا شروع ہوا پھر نہیں رکا۔ جب تک وہ زندہ رہے لگاتار خون ٹپکتا رہا۔ ایڈیٹر نے میری دو تصویریں اگلے دن چھاپی تھیں بس یہیں سے ہنگامہ شروع ہوا تھا۔ میری وہ تصویریں اسکول کے منیجر تک پہنچ گئی تھیں انہوں نے فوراً فیصلہ کیا کہ اس طرح کی عورت کا اسکول میں رہنا ایک لمحے کے لئے بھی ممکن نہیں ہے۔ مجھے اسی وقت کلاس سے بلوایا گیا تھا اور کھڑے کھڑے حساب کر دیا گیا تھا۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسکول سے نکالے جانے کی کیا وجہ تھی۔ ایڈیٹر اور

منیجر کا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ میرے اور ایڈیٹر کے تعلقات پر شبہ کرنا بھی نامناسب ہے ان کی موت کا سبب ان سطحی باتوں میں مت تلاش کیجئے۔

جی! خون کی دھار کی وجہ میں کیا بتا سکتی ہوں؟ جو باتیں میرے بس میں نہیں ہیں۔ ان کے نتیجوں کو میں صرف دیکھ سکتی ہوں کر کچھ نہیں سکتی۔ اگر بہت معمولی طریقے سے سوچئے تو وجہ میں ہو سکتی ہوں۔ وہ خود ہو سکتے ہیں۔ وہ تصویریں ہو سکتی ہیں اور وہ آئینہ بھی ہو سکتا ہے جس میں بار بار وہ اپنی صورت دیکھ رہے تھے۔ نتیجے تک پہنچنے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ ساری ذمہ داری ان چار چیزوں پر تھوپ دیجئے۔ میں وہ آئینہ اور تصویریں اسے صحیح ثابت کرنے کے لئے ضرورت پڑے تو میرے مبینہ عاشق بشن، منیجر صاحب یا ایڈیٹر کو اس سے جوڑ لیجئے میں اور کیا کہہ سکتی ہوں؟ مجھے مجرم ٹھہرا دیجئے۔

جی! میں اس وقت گھر میں نہیں تھی۔

بچی۔؟ بچی انھیں بہت پیار کرتی تھی۔ جی ہاں! بچی نے بھی ان کی آنکھوں سے مسلسل خون کی دھار گرتی دیکھی تھی۔ وہ بہت ڈر گئی تھی اس نے مجھ سے پوچھا تھا انہوں نے بھی یہی کہا تھا۔ "میری طبیعت اچھی نہیں ہے"۔ اس دن سے بچی کا ڈرنا ختم ہو گیا تھا۔ خون کی دھار گرتی رہتی تھی اور وہ ان کی گود یا گلے میں لپٹ کر پیار کرتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے بہتے ہوئے خون کو پونچھ دیتی تھی۔

میں نے بتایا نہ کہ میں ایک جگہ کام تلاش کرنے گئی ہوئی تھی بچی اسکول چلی گئی تھی۔ وہ گھر پر اکیلے تھے۔ جی ہاں نوکری چھوٹنے کے دوسرے دن کی بات ہے مجھے اس حادثے کا کوئی احساس نہیں تھا۔ جس وقت میں گئی تھی اس وقت خون کچھ زیادہ ہی گر رہا تھا لیکن یہ تو معمول کی بات تھی۔

جی! انہوں نے چھت کے شہتیر سے لٹک کر پھانسی لگائی تھی... رسی؟.... کہاں تھی.... چادر تھی۔

مجھے کوئی خبر نہیں ملی۔ کوئی مجھے کہاں خبر دیتا؟ میں چار بجے کے قریب واپس

آئی تب تک سب ہو چکا تھا۔ پولیس آچکی تھی۔ ان کی لاش کو اتار کر پلنگ پر لٹا دیا گیا تھا۔

جی نہیں۔ جس چادر سے انہوں نے پھانسی لگائی تھی۔ وہ وہیں لٹکی ہوئی تھی۔ انھیں دوسری چادر اوڑھا دی گئی تھی پاس پڑوس کے لوگ جا چکے تھے۔ صرف ایک پڑوسی پریشان سے گھوم رہے تھے میں آئی تو پولیس کا ایک آدمی پہرے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میں بھی کچھ نہیں سمجھ پائی تھی۔ میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

سب سے پہلے کس نے بتایا؟ میری بچی نے جی ہاں وہ اسکول سے دو بجے آجاتی ہے۔ وہ مجھ سے پہلے آگئی تھی اور ہمیشہ کی طرح باہر کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑتی ہوئی آئی تھی۔ اور میرے پیروں سے لپٹ گئی تھی۔ میں نے اسے پیار کیا تھا۔ وہ کچھ کہنے کے لئے بے چین تھی۔ وہ ایک دم چہک کر بولی تھی۔ "ممی۔ پاپا کی طبیعت اچھی ہو گئی۔ وہ آرام سے لیٹے ہیں"۔

میں کمرے میں پہنچی تو سب کچھ سمجھ میں آگیا تھا۔ میں دیوار سے سر ٹپکنے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔

وہ واقعی لیٹے ہوئے تھے۔ ناخن اور ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے جسم یرقان زدہ مریض کی مانند پیلا ہو گیا تھا۔ ہاں آنکھیں بند تھیں اور بالکل خشک ان میں خون کیا نمی تک نہیں تھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیل آپ کے پاس ہی ہے خودکشی سے پہلے کی جو باتیں تھیں وہ میں نے آپ کے سامنے بیان کر دی ہیں۔

فیصلہ .... کچھ تو ہو گا ہی .... اور وہ فرد کے خلاف ہی ہو سکتا ہے سچ! فرد کا مطلب ہے تنہا آدمی.... جیسے میں یا آپ یا....

مالتی جوشی

(ہندی)

مس میتھیوز

"کیوں ری! ابھی تک بس نہیں آئی؟" پاپا نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے پوچھا۔

"بس کوئی اتنی جلدی تھوڑی ہی آجاتی ہے" ۔ پاپا کے پیچھے پیچھے دروازے تک آتی ہوئی می نے کہا۔

"اسے تو بس کھانا کھانے کی جلدی پڑجاتی ہے۔ اب بیٹھی رہے گی دروازے پر چوکیداری کرنے کو" ۔ پاپا مسکرا دیئے، اور اپنی لونا پر بیٹھ کر چلے گئے ۔ می اندر باورچی خانے میں چلی گئیں، لیکن لینا اسی طرح بیٹھی رہی ۔ دروازے پر چوکیداری کرنے کو۔

بس آنے میں سچ مچ ابھی بہت دیر تھی ۔ مگر وہ کیا کرے، اسے تو کھانا دیکھتے ہی بھوک لگ جاتی ہے اور پھر ایک بات اور ہے۔ کھانا کھالو تو پڑھنے سے بھی چھٹی مل جاتی ہے، نہیں تو جو بھی ملے گا ٹوکے گا۔ "لینا! بیٹھ کر پڑھائی کرو" ۔ اسی لئے پاپا کے ساتھ جلدی سے کھانا کھا کر گلے میں بستہ لٹکائے یہاں آکر بیٹھ جاتی ہے ۔ یہاں بیٹھنے میں جو مزا آتا ہے وہ کسی کو بتایا نہیں جا سکتا۔ کوئی سمجھے گا ہی نہیں۔

ٹھیک دس بجے "نہرو بال مندر" کی بس نکلتی ہے ۔ اس کنارے پر بیٹھنے والے بچے اسے اب پہچان گئے ہیں، اور روز ٹاٹا کرتے ہیں ۔ پھر دہی والا نکلتا ہے ۔ عجیب سی آوازیں لگاتا ہوا ۔ لینا اس کی نقل اتارتی ہے، اور وہ ہنس دیتا ہے ۔ سوا دس بجے سامنے

والے شرما انکل باہر نکلتے ہیں۔ وہ سڑک تک آئیں گے اور چلائیں گے۔ "لجی سنو! میرا چشمہ دے جانا ذرا میز پر بھول گیا ہوں"۔ شرما انکل مزیدار آدمی ہیں روز کچھ نہ کچھ بھول جاتے ہیں۔ کبھی چشمہ، کبھی قلم، کبھی ٹفن، پھر چچی بھنبھناتی ہوئی باہر آتی ہیں، اور انہیں بھولی ہوئی چیز پکڑا دیتی ہیں۔ لینا روز اندازہ لگاتی ہے کہ آج شرما جی کیا چیز بھولیں گے۔

شرما جی کے بازو میں جو دکشت صاحب رہتے ہیں، ان کے پاس ایک اسکوٹر ہے بالکل کھٹارا۔ روز کم سے کم دس کک تو اس میں لگانے ہی پڑتے ہیں۔ لینا انہیں گنتی رہتی ہے۔ ادھر انکل پسینہ پسینہ ہوتے جاتے ہیں۔ ادھر انٹی ہر بار ببلو کا ہاتھ اونچا کر کے ٹاٹا کرواتی ہیں، خوب ہنسی آتی ہے، ساڑھے دس بجے مس میتھیوز گھر سے نکلتی ہیں، مس میتھیوز لینا کی مکان مالکن ہیں۔ ان سے گھر میں سب ڈرتے ہیں۔ صرف لینا اور لینا کے پاپا ہی ان سے بات کر پاتے ہیں۔

"گڈ مورننگ مس میتھیوز"۔ وہ کہتی ہے۔

"گڈ مورننگ بے بی۔ کھانا کھایا؟" وہ دروازے میں تالا ڈالتے ہوئے پوچھتی ہیں۔

لینا اثبات میں سر ہلا دیتی ہے۔

"ابھی بس نہیں آیا؟"

"گیارہ بجے آئے گی"

"اچھا"۔ مس میتھیوز سیڑھیاں اترتی ہیں۔

"ٹاٹا مس میتھیوز"۔

"باڑی کا چھوٹا سا لکڑی کا پھاٹک بند کرتے ہوئے مس میتھوز ہاتھ ہلا دیتی ہیں۔ سڑک پر بڑی دیر تک ان کے جوتوں کی آواز آتی رہتی ہے۔ کھٹ کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ.....

لیکن آج پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے، اسکوٹر میں انیس کک مار کر دکشت صاحب چلے گئے ہیں۔ شرما انکل باہر نکلے، پھر مفلر کے لئے چلاتے رہے۔ دہی والا پوسٹ مین

سب نکل گئے۔ لیکن میتھیوز کا دروازہ نہیں کھلا۔ آخر لینا سے نہیں رہا گیا۔ بستہ وہیں سیڑھیوں پر پٹک کر وہ پڑوس کے دروازے تک گئی۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے برآمدے کی جالی میں منہ ڈال کر آواز دی "مس میتھیوز!"

"یس بے بی!" ۔ اندر سے تھکی ہوئی آواز آئی۔

"آپ دفتر نہیں گئیں آج؟"

"ہمارا طبیعت ٹھیک نہیں ہے آج" ۔ اندر سے جواب آیا۔

لینا کچھ دیر کھڑی رہی۔ وہ ان سے کیسے کہے کہ آکر دروازہ کھولئے۔ بیچاری بیمار جو ہیں۔

ادھر سے می نکلیں۔ "یہ چھوکری بستہ پھینک کر کہاں بھاگ گئی؟ ارے وہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟"

"مس میتھیوز سے بات کر رہی تھی۔ ان کی طبیعت خراب ہے"۔

"پھر نام لیا تو نے آنٹی نہیں کہا جاتا؟"

می شاید اور بھی ڈانٹتیں، مگر بس کا ہارن سنائی دیا۔ اور لینا بستہ لے کر بھاگ نکلی۔

ویسے یہ ڈانٹ اس نے پہلی بار نہیں سنی تھی۔ می نے پتہ نہیں اسے کتنی بار ٹوکا ہوگا مگر اس کی زبان پر لفظ آنٹی آتا ہی نہیں تھا۔ مس میتھیوز کتنی الگ لگتی ہیں کتنی بارعب۔ آنٹی وانٹی ان پر اچھا تھوڑی ہی لگتا ہے۔

مس میتھیوز بیمار ہیں، اسے واقعی بہت افسوس ہو رہا تھا۔ لیکن بس میں پاؤں رکھتے ہی وہ سب کچھ بھول بھال گئی۔ شوبھا اور اسمیتا نے اس کے لئے جگہ روک رکھی تھی۔ اس نے دوڑ کر اپنا قبضہ جما لیا پھر سونالی نے جیب سے بڑی سی املی نکالی، اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے سبھوں میں بانٹ دی۔ اسکول پہنچنے سے پہلے وہ املی سب کے گلے سے اتر چکی تھی۔

اسکول پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج سب لوگوں کو چڑیا خانہ دکھانے لے جایا جائے

گا۔ وہاں سے پھر تندن بن۔ وہاں ناشتہ وغیرہ کرنے کے بعد سبھوں کو گھر پہنچا دیا جائے گا۔ پہلے تو لڑکیاں کچھ کنہائیں۔ جب دیکھو یہیں آس پاس گھما لاتے ہیں لیکن ایک بار وہاں پہنچنے پر وہ وہاں کھانے کھیلنے میں ایسی محو ہو گئیں کہ وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ گھر لوٹتے لوٹتے پورے چھ بج گئے تھے۔ لینا تو اتنی تھک گئی تھی کہ کسی طرح دو لقمے کھا کر نڈھال ہو کر پڑ گئی۔

پیاس لگنے پر رات گئے جب اس کی آنکھ کھلی تو سب لوگ جاگ رہے تھے۔ بھیا ٹیبل لیمپ لگائے پڑھ رہے تھے، می پاپا باتیں کر رہے تھے۔

می کہہ رہی تھیں۔ "میں نے ان سے کہا آپ درخواست دے دیجئے۔ بھرت دفتر میں دیتا آئے گا اور آپ کی دوا بھی لیتا آئے گا۔ پتہ ہے اس پر کیا کہا انہوں نے؟"

"کیا؟" ۔ پاپا نے پوچھا۔

"بولیں کہ مجھے ریٹائر ہوئے تو دو سال ہو گئے ہیں"۔

"ارے! پھر روز...."

"یہی تو میں نے پوچھا کہنے لگیں برسوں کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ ٹائم سے تیار ہو جاتی ہوں۔ گھر میں دل نہیں لگتا"۔

"جاتی کہاں ہیں روز؟"

"یہی کبھی بینک، کبھی لائبریری، کبھی اسپتال، کبھی پارک میں بیٹھ آتی ہوں گھنٹے دو گھنٹے"۔

"کون می؟" ۔ لینا نے اچانک سوال کیا۔

"ارے تو اب تک جاگ رہی ہے" ۔ پاپا نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

"آپ ذرا اسے سمجھا دیجئے۔ نام لے کر بلاتی ہے انہیں بھلا اچھا لگتا ہے یہ؟" می نے شکایت کی۔

اچھا تو یہ مس میتھیوز کی بات ہو رہی تھی۔ ہائے! اسے تو یہ یاد ہی نہ رہا کہ وہ بیمار ہیں۔ ایک بار بھی وہ انہیں دیکھنے نہیں گئی۔

صبح غسل سے فارغ ہوتے ہی اس نے پڑوس کی راہ لی۔ دروازہ کھلا ہوا ملا۔ شاید دھنی رام کام کرنے آگیا تھا۔

"گڈ مارننگ مس میتھیوز"۔

"گڈ مورننگ بے بی"۔ انہوں نے کمزور آواز میں کہا۔ وہ اب بھی بستر پر لیٹی ہوئی تھیں۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ چائے پینا؟" انہوں نے پوچھا۔

اسے انکار کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ دھنی رام دو کپ میز پر رکھ گیا۔

"چائے پینے سے ممی ناراض ہوتی ہیں"۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہم بول دے گا ممی کو"۔

"آپ کا نام لینے سے بھی ممی خفا ہوتی ہیں۔ کہتی ہیں آنٹی کہو"۔

"آنٹی؟ نہیں تم ہم کو گرینی بولو"۔

"گرینی کیا ہوتا ہے؟"

"گرینی مینس گرینڈ مدر۔ نانی!"

"ہش! نانی تو بوڑھی ہوتی ہیں۔ دن بھر مالا جپتی رہتی ہیں"۔ اس نے منہ بنا کر کہا۔

"ہم بھی بوڑھا ہے۔ بھگوان کا نام لیتا ہے" مس میتھیوز نے جیب سے مالا نکال کر اسے چوما۔ آنکھوں سے لگایا۔ پھر واپس جیب میں رکھ دیا۔ اس وقت وہ لینا کو سچ مچ بوڑھی نظر آئیں۔ مگر پھر بھی اس کا دل انہیں نانی کہنے پر رضامند نہ ہوا۔

"لینا! کہاں چلی گئی یہ چھوکری؟ کمرے بھر میں کتابیں پھیلا رکھی ہیں، اور خود صبح صبح نہ جانے کہاں غائب ہو گئی"۔

پچھواڑے آنگن سے ممی کا بھنبھانا صاف سنائی دے رہا تھا۔ لینا ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی "ممی بلا رہی ہیں شاید۔ میں چلوں؟ آپ اب جلدی سے اچھی ہو جایئے۔

ایں ؟" ۔ اپنے گھنگریالے بالوں والا سر ہلا کر اس نے کہا پھر اپنا ننھا سا ہاتھ اٹھا کر بولی ۔ " گڈ مورننگ " ۔ مس میتھیوز نے مسکرا کر کہا اور آنکھیں موند لیں ۔ لیکن دھنی رام نے انہیں سونے نہ دیا ۔ بولا ۔ " یہ بے بی کتنا کباڑا اکٹھا کیا ہے ، دیکھئے ان کی اماں ڈانٹتی ہیں تو سارا کپڑا ادھر ڈال جاتی ہیں ۔ ہم پھینک دیں گے کل کو سب " ۔

" اوہ ۔ نو ۔ بچہ کا کھلونا ہے ۔ رہنے دو " ۔

" یہ کون سے ڈیزائن کا کھلونا ہے ۔ دیکھئے تو ۔ سگریٹ کا ڈبہ ، مور پنکھ اور .... "

" رہنے دو ۔ رہنے دو " ۔ مس میتھیوز جب زور سے نہیں بول سکیں تو انہوں نے اشارے سے اسے سمجھایا ۔ دھنی رام نے بڑبڑاتے ہوئے سارا کباڑ خانہ واپس اسی جوتے کے کھوکھے میں بھر دیا ، اور دوسرا کام کرنے لگا ۔ اسے اپنے پڑوسیوں پر بہت غصہ آرہا تھا ۔ اپنے بچوں کے شوق خود پالیں دوسروں کو پریشان کرنا کہاں کی شرافت ہے ۔ میم صاحب بے چاری سیدھی ہیں ۔ اسے ہنسی آگئی ۔ یہ میم صاحب بھلا کہاں کی سیدھی تھی ایک دم آگ ہیں آگ ۔ پتہ نہیں اس بیٹیا نے کیا جادو کر دیا ہے ۔

خود مس میتھیوز بھی اس وقت یہی سوچ رہی تھیں ۔ ان دنوں انہیں کیا ہو گیا ہے ۔ کیا ریٹائرمنٹ کے ساتھ آدمی کی فطرت بھی بدل جاتی ہے ۔ نہیں تو کتنی اسٹرکٹ تھیں وہ ۔ پورا اسٹاف ان کے نام سے کانپتا تھا ۔ اسنومین اینڈ لاریل ، میں وہ ٹیرر کے نام سے مشہور تھیں ۔ ۔ منیجر تک ان سے ادب سے بات کرتا تھا ۔ فیمیل اسٹاف کی تو وہ جیسے دشمن تھیں ۔ ذرا سی غلطی نظر آئی اور چلا پڑیں ۔ " ارے بابا کائے کو ادر میں آتا تم لوگ ۔ ماں باپ سے بول کر جلدی شادی کیوں نہیں بناتا ۔ کمپنی کا پیسہ اور ہمارا دماغ برباد کرتا ہے " ۔

زندگی بھر کا سرمایہ لگا کر یہ چھوٹا سا مکان بنوا لیا تھا ۔ لیکن کرایہ دار خوب ٹھونک بجا کر رکھتی تھیں ۔ ایک تو ٹرانسفر والی نوکری سب سے بڑی شرط تھی ، انہیں کسی کا بھی گھر میں جم کر بیٹھ جانا گوارا نہیں تھا ۔ پھر بچے بھی زیادہ نہ ہوں ، لوگ پڑھے لکھے ہوں ، انہیں گالم گلوج ، شور شرابا پسند نہیں تھا ۔ اسی لئے جو بھی کرایہ دار آیا ان سے

ڈرا ڈرا ہی رہا۔ اونچی آواز میں کوئی ریڈیو تک نہیں بجاتا تھا۔ کوئی چار ماہ قبل یہ ٹنڈن خاندن اس مکان میں آیا تھا۔ دو بچے اور میاں بیوی بس۔ سنٹرل گورنمنٹ کا ٹرانسفر یبل جاب۔ مس ییتھیوز خوش تھیں۔ شکایت کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ایک صبح وہ گارڈیننگ کر رہی تھیں، باہر کی طرف کھلی جگہ میں انہوں نے کچھ درخت کچھ گملے لگا رکھے تھے۔ صبح شام انہیں کو سنوارا کرتی تھیں۔ دوسری طرف والا حصہ کرایہ داروں کے پاس تھا۔ کوئی شوقین ہوتا تو کچھ باغبانی کر لیتا۔ کسی کے وقت میں زمین یوں ہی پڑی رہتی۔ نئے کرایہ داروں کو آئے ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ ہو گیا تھا۔ ابھی تک باغبانی کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ یہی سب کچھ سوچ رہی تھیں کہ پیچھے سے باریک سی آواز آئی۔ "سنئے!"

انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ ٹنڈن خاندان کی چھوٹی لڑکی جڑ سمیت اکھڑا ہوا پودا لئے کھڑی تھی۔

"یہ پیڑ اپنے باغیچے میں لگالیں گی؟" اس نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

"کائے کا پیڑ ہے؟"

"میری سہیلی نے دیا ہے۔ اس میں نیلے نیلے پھول آتے ہیں۔ اتنے بڑے بڑے" اس نے اپنی چھوٹی سی ہتھیلی پھیلا کر بتایا۔

مس ییتھیوز کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دیں، وہ انہیں خاموش دیکھ کر پھر بولی۔ "اس اتوار کو پاپا اور بھیا باغیچے کی کھدائی کریں گے۔ کیاریاں بن جائیں گی تو ہیں پیڑ وہاں لگا دوں گی تب تک یہاں لگا رہے گا میں روز پانی دے جایا کروں گی"۔ اس نے گردن مٹکا کر کہا۔ پھر ان سے منع ہی نہیں کیا جا سکا۔ گلابوں کے پاس جو تھوڑی سی جگہ تھی وہیں اس پودے کو لگا دیا گیا۔ اس کے بعد کئی اتوار نکل گئے۔ پڑوس کے باغیچے کی مہورت نہیں ہو سکی۔ دو چار دن تک لینا پودے میں پانی ڈالتی رہی۔ پھر اس میں کمی آتی گئی۔ کبھی کبھی تو اسے کھلاتا دیکھ کر وہ خود ہی پانی دے دیتیں۔ کچھ دنوں بعد تو جیسے وہ اس باڑی کا ہو گیا۔ نیلے پھول جن کا انتظار تھا اب تک نہیں آئے

تھے۔ کچھ دنوں بعد مس میتھیوز نے دیکھا کہ پودے کے سائے میں ایک گول سا چکنا پتھر رکھا ہوا ہے، اور انہیں کے باغیچے کے دو پھول اس کی زینت میں اضافہ کر رہے ہیں۔

"یہ کیا ہے؟" ۔دوسرے دن انہوں نے لینا سے پوچھا جو ہاتھ جوڑے، آنکھیں موندے ان کے سامنے کھڑی تھی۔

"یہ شنکر جی ہیں۔ ہم لوگ اس دن اونکاریشور گئے تھے نا۔ وہیں سے لائے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے ان کی پوجا کرنے سے جلدی جلدی پاس ہو جاتے ہیں"۔

"تو پوجا گھر میں کرو۔ تم جنگل میں بھگوان کو رکھ دیا"۔

"گھر میں بھیا چڑاتے ہیں۔ نقل اتارتے ہیں۔ پھر میں رونے لگتی ہوں تو ممی دونوں کو ڈانٹتی ہیں.... آپ سے بھیا ڈرتے ہیں نا۔ ادھر نہیں آئیں گے"۔ یہ آخری بات اس نے کسی راز کی طرح سرگوشی میں بتائی۔

پتہ نہیں کیا سوچ کر مس میتھیوز نے شنکر جی کو وہاں سے اٹھا کر برآمدے کے ایک طاق میں رکھ دیا۔ لینا روز نہا کر آتی اور مہادیو جی پر پھول چڑھاتی۔ ہاتھ جوڑ کر کچھ گنگناتی، اور پھر چلی جاتی۔ مس میتھیوز کو دیکھنے میں یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا تھا۔ لیکن بھکتی کا یہ سلسلہ بھی صرف چند ہی دنوں تک رہا، پھر کئی کئی دن تک شنکر بھولے سے بھی اپنی پجارن کے درشن نہ کر پاتے۔ باسی پھول کئی کئی دنوں تک چڑھے رہتے جنہیں کبھی مس میتھیوز اور کبھی دھنی رام اٹھا کر پھینکتے۔

اس کے کچھ دنوں بعد وہ راجیش کھنہ کی ایک رنگین تصویر لے کر آئی تھی۔ اس کی ایک سہیلی نے کلنڈر سے کاٹ کر وہ تصویر اسے دی تھی، دیکھتے ہی بھیا جھپٹ پڑے تھے۔ لیکن سہیلی کی دی ہوئی چیز وہ بھیا کو کیسے دے دیتی۔ بھیا نے دھمکی دی کہ وہ پاپا سے شکایت کر دیں گے۔ پاپا تو سینما کی تصویروں سے چڑتے ہی ہیں پھاڑ پھوڑ کر اس پیاری تصویر کو پھینک دیں گے اسی لئے اسے مس میتھیوز کے پاس رکھ دینا ہے کچھ دنوں بعد بھیا بھول جائیں گے تو وہ چپ چاپ لے جا کر اپنی ڈسک میں رکھ دے گی۔ مس میتھیوز کی میز پر گلاس کور کے نیچے راجیش کھنہ براجمان ہو گئے جو شاید اب بھی

ہوں۔

اس کی بے شمار سہیلیاں تھیں۔ روز ہی ان کے ساتھ لین دین چلتا رہتا۔ عجیب عجیب چیزیں ہوتی تھیں ان لڑکیوں کے پاس۔ مور کے پر۔ سانپ کی کینچلی۔ گریٹنگ کارڈز، چوڑیوں کے رنگین ٹکڑے، خوشبودار صابن کے ریپرز۔ سگریٹ کے خالی پیکٹ سارا سامان آہستہ آہستہ مس میتھیوز کے گھر میں جمع ہوتا جارہا تھا۔ کیونکہ گھر میں بھیا ہمیشہ اس کے خزانے کی ٹوہ میں رہتے۔ اور ممی اسے پھینکوانے کی فکر میں۔ مس میتھیوز نے اسے جوتوں کا ایک خالی ڈبہ دے رکھا تھا۔ اسی میں سارا سامان جمع تھا۔ جب کسی سہیلی سے کوئی سودا پٹانا ہوتا تبھی لینا اسے اٹھاتی تھی ورنہ یہ ایک کونے میں چپ چاپ پڑا رہتا۔ اکثر کچرا نکالتے ہوئے دھنی رام جھنجلا اٹھتا تھا مگر اس کا سامان پھینکنے کی اس میں ہمت نہ ہوتی تھی۔

اس دن شام کو لینا نے حد کر دی۔ دو دن کے بخار سے ٹوٹی ہوئی سی وہ برآمدے میں لیٹی تھیں کہ آواز آئی۔ "گڈ مورننگ مس میتھیوز"۔

"گڈ مورننگ۔ اسکول سے ابھی آیا؟"

"نہیں تو۔ بہت دیر ہو گئی ہمیں آئے ہوئے۔ اپنی ایک سہیلی کے یہاں گئے تھے۔ اچھا آپ آنکھ بند کیجئے تو ایک چیز بتائیں"۔

لیکن انہیں آنکھ بند کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ایک مخملی اون کا گولا سا خود ہی ان کی گود میں آکر گرا اور بولا۔ "میاؤں!"

"اوہ! ہاؤ لولی!"

"ہماری سہیلی نے دیا ہے۔ اس کی بلی نے چار بچے دیئے ہیں لیکن یہ سب سے پیارا ہے"۔ لینا نے فخر کے ساتھ کہا۔

"کتنی سہیلی ہیں تمہارے پاس؟"

"ڈھیر ساری۔ اچھا مس میتھیوز۔ کوئی اچھا سا نام بتایئے اس کے لئے۔ پوسی دوسی نہیں۔ سب کے یہاں پوسی ہوتی ہے"۔

مس یتھیوز پیار سے اس کے ریشمی جسم پر ہاتھ پھیرتی رہیں اور جیسے انہیں ایک دم نام سوجھ گیا۔ "اس کو اپن سلکی بولیں گے۔ سلکی یعنی ریشم۔ معلوم ہے"۔

لینا نے سر ہلا کر نام پاس کر دیا پھر آہستہ سے بولی۔ "مس یتھیوز! آپ دو چار دن اسے اپنے یہاں رہنے دیں۔ ممی بہت ناراض ہو رہی ہیں، اور بھیا کہتے ہیں کہ کنوئیں میں پھینک دیں گے"۔

مس یتھیوز بے چاری پریشان۔ کیا جواب دیں۔

"یہ گندا کرے گا نا تو میں صاف کر دوں گی۔ ابھی چھوٹا ہے نا۔ پھر سیکھ جائے گا"۔

اس نرم اون کے گولے کو ان کی گود ہی میں چھوڑ کر وہ گھر گئی۔ اور بھاگ کر ایک کٹوری میں دودھ لے آئی۔ اپنی گود میں بٹھا کر وہ اسے دودھ پلانے کی کوشش کرتی رہی۔ دودھ پلا کر لینا نے بچے کو ایک پرانے فراک میں لپیٹ کر مونڈھے پر سلا دیا۔ اور کل آنے کا کہہ کر اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

صبح بھی وہ اسی طرح چپ چاپ آئی۔ ہر روز کی طرح گڈ مورننگ کا نعرہ اس نے بلند کیا۔ بلی کو دودھ پلا کر اس نے فراک کو دھو کر سکھا دیا۔ آج وہ کمبل کا ایک ٹکڑا بھی لائی تھی۔ صبح شام آکر وہ اسی طرح سلکی کو نرس کرتی رہی۔ وہ دبے پاؤں آتی، اور سب کام کر کے چپ چاپ لوٹ جاتی۔ ظاہر تھا وہ گھر سے چھپ کر آتی تھی۔

بیماری کے بہانے پانچ سات دن گھر میں گزارنے کے بعد مس یتھیوز کا دل باہر جانے کو تڑپنے لگا۔ کتنے ہی کام رکے پڑے تھے۔ بنک سے روپیہ نکلوانا تھا۔ لائبریری سے کتابیں بدلوانی تھیں اسپتال میں جا کر ایک بار چیک اپ کروانا تھا۔ اس دن کھانا وانا کھا کر وہ باہر نکلیں۔ دروازے کا تالا ڈال ہی رہی تھیں کہ آواز آئی۔

"میاؤں!"

وہ چونک گئیں۔ اس نئی بلا کو تو وہ بھولی ہی جا رہی تھیں۔ اب کیا ہو؟ دو گھنٹے اگر گھر میں بند رہے تو اس کا دم تو نہیں گھٹ جائے گا۔ انہیں کتوں، بلیوں کا کوئی

تجربہ نہیں تھا۔ وہ بہت پس و پیش میں پڑ گئیں۔ آخر کار جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اسے گود میں اٹھا کر پڑوس میں گئیں اور بولیں "مسز ٹنڈن۔ یہ بلی ابھی آپ دیکھنا۔ ہم کو ضروری بنک میں جانے کا ہے"۔

مسز ٹنڈن مزے میں بیٹھی سوئٹر بن رہی تھیں مس ینتھیوز کے ہاتھ میں بلی کا بچہ دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا "ہائے یہ نالائق لڑکی آپ کے سر منڈھ گئی کیا اس بلا کو بہت شیطان ہے۔ کبھی طوطا لے آئے گی۔ کبھی کتے کا پلا اٹھا لائے گی تو کبھی بلی کا بچہ۔ اب بتایئے، بھلا اس مہنگائی میں بچوں کو ڈھنگ سے کھلایا نہیں جاتا ان کے کتے بلیوں کے لئے دودھ کہاں سے آئے؟"

مس ینتھیوز کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس میل ٹرین کو کہاں روکیں کہ وہ خود بخود رک گئیں مگر پھر سانس لے کر بولیں۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ میں بھرت سے کہہ دوں گی، شام کو بوری میں بھر کر دور چھوڑ آئے گا"۔

"اوہ نو۔ ہم اسے پالا ہے"۔ مس ینتھیوز نے سختی سے کہا۔ اس بچے کو بوری میں بھرنے کے خیال ہی سے انہیں جھرجھری سی آگئی۔ اسے گھر میں بند کر کے جانا ہی انہیں زیادہ محفوظ معلوم ہوا۔

شام کو لینا سلکی کے لئے دودھ لائی تو انہیں خیال آیا کہ یہ لڑکی اپنے حصے کے دودھ میں سے ہی کچھ بچا کر نہ لاتی ہو۔ انہوں نے کہا۔ "بے بی! سلکی کا واسطے ہم آج زیادہ دودھ لیا ہے۔ روز لینے کا ہے تم دودھ نہیں لانا"۔

ان کا خیال تھا کہ لینا اداس ہو جائے گی مگر انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ جاتے ہوئے کود پھاند کر سیڑھیاں اتری، اور گھر کا دروازہ بھی اس نے زور کی آواز کے ساتھ دھکا دے کر بند کیا۔ صاف ظاہر تھا کہ لینا کے سر سے ایک بوجھ اتر گیا تھا۔ بلی کا بچہ وہ بڑے شوق سے لائی تھی۔ بہت ارمان تھا کہ اسے گود میں لے کر پڑھائی کرے گی اسے اپنی رضائی میں لے کر سوئے گی لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ لینا جیسے ایک بندھن سے بندھ گئی تھی مگر مس ینتھیوز نے اس کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ لینا آزاد ہو

گئی تھی۔ سلکی مس میتھیوز کے گھر کا ہو گیا تھا۔ کبھی کبھار جا کر اسے پیار کر لینے سے ہی لینا کا جی بہل جاتا تھا۔ دن اچھے بھلے گزر رہے تھے، کہ ایک دن مسٹر ٹنڈن بری سی خبر لے کر آئے۔ وہ ہر مہینے کی طرح پانچ تاریخ کو مکان کا کرایہ دینے آئے تھے۔ اٹھتے ہوئے بولے۔ "آپ کا ساتھ چھوٹ رہا ہے مس میتھیوز"۔

"کیوں؟"

"ٹرانسفر ہو رہی ہے میری۔ دلی"۔

"ارے! اتنا جلدی؟"

"یہی تو۔ دیکھئے نا۔ یہ لوگ کچھ سوچتے بھی نہیں۔ بچوں کی پڑھائی، سامان، سبھی طرح کا نقصان ہوتا ہے۔ پرموشن پر بھیج رہے ہیں نہیں تو میں جاتا بھی نہیں"۔

"کب جائیں گے؟"

"بس اگلے مہینے۔ بچوں کے امتحان کے بعد.... ویسے یہاں بہت اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ لینا آپ سے بہت گھل مل گئی تھی"۔

وہ اسی طرح کچھ بھلی بھلی باتیں کر کے چلے گئے اور مس میتھیوز ہاتھ میں سے پیسے لئے خاموش بیٹھی رہیں۔ اس کا مطلب ہے پھر نئے لوگ، نئے طور طریقے، نئے تعلقات۔ انہیں لگا کہ وہ اتنی تھکتی جا رہی ہیں کہ بار بار نئے سرے سے ایڈجسٹ کرنا ان کے بس کی بات نہیں رہی۔ لیکن لینا بہت خوش ہو رہی تھی۔ "آپ کو پتہ ہے مس میتھیوز۔ ہم لوگ دلی جا رہے ہیں"۔ اس نے کہا۔

"پتہ ہے"۔

"آپ کو معلوم ہے دلی کتنا بڑا شہر ہے۔ بہت بڑا وہاں دو دو ہوائی جہاؤں کے اسٹیشن ہیں، اور پتہ ہے دو منزلہ بس چلتی ہے وہاں اور ہے نا وہاں قطب مینار بھی ہے۔ ہماری جغرافیئے کی کتاب میں تصویر ہے اس کی"۔

"ادھر جا کے ہم کو بھول جائیں گا نا؟" مس میتھیوز نے اداس لہجے میں پوچھا۔

"ارے واہ! بھول کیوں جائیں گے۔ ہم تو آپ کو خط لکھیں گے۔ ہمیں

سکھاتے ہیں خط لکھنا۔آپ پتہ دیں گی نا اپنا؟"

اور وہ دوڑ کر گھر سے ایک چھوٹی سے کاپی اٹھالائی، جو پرانی کاپیوں کے کاغذ پھاڑ کر بنائی گئی تھی، اس میں ٹیڑھے میڑھے حروف میں نینا، بینا روما، لتا۔ پتہ نہیں کتنے ہی پتے لکھے ہوئے تھے۔ مس میتھیوز نے ایک خالی صفحہ دیکھ کر اپنا بھی پتہ لکھ دیا ویسے انہیں معلوم تھا کہ کوئی خط آنے والا نہیں ہے، اور اگر آیا بھی تو ایک آدھ۔اس کے بعد پتہ نہیں کاپی ہی کہیں کھو جائے۔

پڑوس کے گھر میں جب سامان بندھنے لگا تو انہیں محسوس ہوا کہ ان کا اپنا گھر بھی اکھڑے ہوئے خیمے کی مانند ویران ہو گیا ہے مسز ٹنڈن نے مدد کے لئے دھنی رام کو بلوایا تھا۔مس میتھیوز نے اسی کے ہاتھ لینا کا سارا سامان بھیج دیا تھا، مگر شام کو سب کچھ ردی کے ڈھیر میں پڑا ملا۔اس کباڑ کو مسز ٹنڈن بھلا کہاں پیک کرتیں۔وہاں وہ بھولے شنکر کو اتنی بیدردی کے ساتھ نہیں پھینک سکیں۔دھنی رام سے بولیں۔ بھیا! چار چھ دن تک بیٹا ان کی پوجا کرتی رہی ہے کہیں کنواں دیکھ کر اس میں ڈال دینا"۔

لینا کو ان باتوں کا کوئی ملال نہیں تھا،یہاں تک کہ اسے سکی سے بچھڑنے کا بھی افسوس نہیں تھا۔دلی میں پاپا کو بڑا سا کوارٹر ملا تھا، اور ممی نے وعدہ کیا تھا کہ وہاں وہ اسے ایک السیشن دیں گی۔جانے والے دن مس میتھیوز نے ان لوگوں کو چائے پر بلایا تھا، تمام وقت دونوں میاں بیوی ان کی تعریفیں کرتے، اور لینا کی زیادتیوں کے لئے معافی مانگتے رہے۔لینا کی طرف سے انہوں نے بار بار دلی آنے کی دعوت بھی دی۔ مس میتھیوز صرف مسکرا کر رہ گئیں۔مسز ٹنڈن نے لینا اور سکی کے ساتھ ان کی ایک تصویر بھی اتاری۔

شام کو دروازے پر ٹیکسی آکر کھڑی ہوئی۔

" وہ لوگ جا رہے ہیں میم صاحب"۔دھنی رام نے کہا۔وہ اٹھنے ہی والی تھیں کہ وہ لوگ خود ہی خدا حافظ کہنے آگئے۔اخلاقی طور پر انہیں بھی چھوڑنے کے لئے باہر تک جانا پڑا۔لینا پہلے سے ہی ٹیکسی میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔اس کی آس پاس کی سہیلیاں

کھڑکیوں کے پاس ہو کر اسے خدا حافظ کہہ رہی تھیں۔

"گڈ مارننگ مس میتھیوز۔ ہم جا رہے ہیں"۔ انہیں دیکھتے ہی لینا نے جھک کر کہا۔

"بیوقوف! ہر وقت کوئی گڈ مورننگ کہا جاتا ہے۔ گڈ بائی بولو۔ گڈ بائی"۔ دسویں جماعت کا امتحان دینے والے قابل بھیا نے اسے ڈانٹ پلائی۔

"اوہ! ڈونٹ ٹیچ ہر دیسٹ آؤفل ورڈ"۔ مس میتھیوز نے تڑپ کر کہنا چاہا مگر ان کی آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔

اندھیری سڑک کو چیرتی ہوئی ٹیکسی کو وہ دور تک دیکھتی رہیں۔ بک بک کرنے والے دھنی رام کو انہوں نے پھاٹک سے ہی رخصت کر دیا۔ موٹا انعام پا کر وہ کچھ زیادہ ہی خوش ہو رہا تھا۔ پھر لکڑی کا گیٹ بند کر کے وہ اندر کی طرف مڑیں۔ انہوں نے اس تالے کو دیکھا جو برابر والے دروازے پر لٹک رہا تھا، اور جس کی چابی ان کی جیب میں تھی۔ اس کے بعد بھاری قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر وہ اپنے گھر میں داخل ہوئیں۔ گھر میں گھپ اندھیرا تھا۔ ایک کونے میں دو جگنو سے چمک رہے تھے۔ انہوں نے سوئچ آن کیا۔ ان کی رضائی پر بیٹھا سکلی انہیں گھور رہا تھا۔

اوشا پرانڈے

(ہندی)

تعزیت

اپنی کالی ٹائی کی گرہ ٹھیک کرتے ہوئے شری پرانجپے، کلب کے ہال میں داخل ہوئے۔ اس وقت کلب کے سکریٹری شری کالے اور خواتین میں سے شریمتی داتار ٹیبل ٹینس کی ہری میز کے پاس ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ آس پاس کی دس بارہ کرسیاں خالی ہی پڑی تھیں۔ اتنے کم لوگوں کو دیکھ کر شری پرانجپے کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "یہ کیا مسٹر کالے، اور کوئی نہیں آیا؟"

خوابوں کی دنیا سے واپس آتے ہوئے اور صدر کے تئیں احترام کا اظہار کرنے کے لئے کھڑے ہوتے ہوئے شری کالے نے جواب دیا۔ "نہیں ابھی کوئی نہیں آیا"۔

صدر نے خیالات میں ڈوبے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "چار تو بج چکے ہیں"۔

"ہاں"۔

"شری رانگنے کر کو تو میں نے...."

"کیا پتہ۔ میں نے تو بورڈ پر میٹنگ کا نوٹس لگا دیا تھا۔ باقی تیاریاں بھی ہو چکی ہیں"۔

شری پرانجپے کرسئ صدارت پر براجمان تھے لیکن خالی کرسیاں ان کی آنکھوں میں چبھ رہی تھیں۔ دل ہی دل میں انھوں نے کہا۔ "کمال ہے کوئی تفریحی جلسہ ہو تو سب لوگ پانچ دس منٹ پہلے ہی آجاتے ہیں لیکن چونکہ اس میٹنگ میں تعزیتی تجویز پاس

کرنی ہے اس لئے کوئی بھی حاضر نہیں"۔

اپنے کالے کوٹ میں سے انھوں نے تعزیتی تجویز کا کاغذ نکالا اور میز پر پٹک دیا۔ ماتھے کا پسینہ رومال سے پونچھتے ہوئے شری کالے سے کہا۔"یہ تجویز آپ کو کیسی لگی؟"

شری کالے نے کاغذ اپنی طرف کھینچا۔ شریمتی داتار نے جہاں تک ہو سکا جھک جھک کر پڑھنا شروع کیا۔

"بہت اچھا" ۔ شری کالے نے کہا۔"کیا زبان ہے ۔ لاجواب ۔ ایسی زبان پڑھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے"۔

"میں نے جان بوجھ کر ایک ایڈیٹر سے یہ تجویز لکھوائی ہے کیونکہ اسے اخباروں کو بھیجنا ہے"۔

"کیا تجویز اخباروں میں بھیجیں گے آپ؟" ۔ شریمتی داتار نے پوچھا۔

"ہاں ہاں ۔ کیوں نہیں ضرور بھیجیں گے ۔ وجہ یہ ہے کہ ایسی تجویزیں پاس کرنے سے ہمارا کلب مفت میں مشہور ہو جاتا ہے"۔

"تو کیا ہمارے نام بھی چھپیں گے؟"

"آف کورس پریس میں خبر ہی ایسی دیں گے ۔ فلاں فلاں ممبر موجود تھے ۔ انھوں نے ہی یہ تجویز پاس کی ہے"۔

"ہائے" ۔ شریمتی داتار نے افسوسناک لہجے میں کہا۔"مجھے پہلے معلوم ہوتا تو میں مسٹر داتار کو بھی لے آتی"۔

شری کالے نے گھڑی دیکھی ۔ سوا چار بج رہے تھے۔

مسٹر رانجپے کی آنکھیں پھیل گئیں ۔"لیٹ اس ویٹ"۔

اتنے میں دروازے کے پاس ایک کار آکر رکی ۔ شری رانجپے پر امید ہو گئے۔ انھوں نے کہا۔"شاید مسٹر رانگنے کر آگئے ہیں"۔

شری کالے نے گردن اونچی کر کے کھڑکی میں سے جھانکا۔"ہاں وہی ہیں"۔

"مسٹر چیما، منیار، ناڈگیر ۔ گڈ ۔ کافی ممبر اکٹھے آگئے"۔

شری رانگنے کرنے داخل ہوتے ہوئے کہا۔" دیکھئے مسٹر پرانچپے آپ کے کہنے کے مطابق میں کتنوں کو پکڑ لے آیا ہوں"۔

"تھینک یو"۔

شری چیمانے شری پرانچپے کو سنجیدہ دیکھ کر کہا۔" کیوں آج مورننگ سوٹ میں؟"

"ہاں آج تعزیتی تجویز پاس کرنی ہے نا!"

شری چیمانے تعجب سے پوچھا۔" کس کی تعزیت ؟ہواز ڈیڈ؟"

"آپ کو نہیں معلوم؟"

"نہیں۔میں نہیں جانتا"۔شری رانگنے کرنے کہا۔"میں سمجھا میٹنگ ہے اس لئے آگیا"۔

"ہمارے سابق صدر شری ستیہ دان کھوٹے کا گزشتہ ہفتے انتقال ہو گیا"۔

شری چیما کے چہرے کی سنجیدگی غائب ہو گئ۔وہ بے فکر لہجے میں بولے۔" اچھا۔وہ ایڈیٹ۔او۔کے پاس کر دیجئے تجویز"۔پھر ملٹری سیلوٹ مار کر بولے۔"میں نے فوجی انداز سے انھیں آخری سلامی پہلے ہی دے دی ہے"۔

"مسٹر چیما۔بی سیریس۔ہم لوگ رنج و غم کا اظہار کرنے جارہے ہیں"۔

"لجی جانے بھی دیجئے مسٹر کالے"۔شریمتی داتار نے سمجھوتہ کرانے کے انداز میں کہا۔"تعزیتی تجویز محض ایک رسمی چیز ہے"۔

شریمتی داتار کی حمایت کی وجہ سے شری چیما اکڑ گئے۔انھوں نے کرسی کھینچ لی۔ تب تک باقی لوگ بھی بیٹھ چکے تھے۔

شری پرانچپے نے گھڑی کی جانب دیکھا اور پھر سنجیدگی سے کہا۔" دوستو اس وقت چار پچیس ہو رہے ہیں اس لئے اب کارروائی شروع کی جائے"۔

چہرے پر رومال کا ڈسٹر پھیرتے ہوئے انھوں نے تقریر شروع کی۔"آج ہم سب بڑے دکھی دل سے اکٹھے ہوئے ہیں۔ہمارے ایک سرگرم رکن اور سابق صدر شری

ستیہ دان کھوٹے پچھلے ہفتہ وفات پا گئے۔ ان کی موت سے ہمارے آنند کلب پر رنج و غم چھا گیا مگر موت سے کس کو رستگاری ہے۔ یہی سوچ کر ہمیں صبر کرنا چاہئے۔ انھیں خراج عقیدت پیش کرنے اور بے وقت جدائی سے متعلق تعزیتی تجویز پاس کرنے کے لئے ہم یہاں اکٹھے ہوئے ہیں اس لئے جن جن صاحبان کو خراج عقیدت پیش کرنا ہے وہ تقریر کر سکتے ہیں لیکن وقت تھوڑا ہے۔ ہر کسی کو صرف دس منٹ ہی ملیں گے"۔

شری پرانجپے بیٹھ گئے اور انھوں نے نصف منٹ انتظار کیا مگر کوئی نہ اٹھا۔ مایوس ہو کر انھوں نے کہا"۔ کیا مطلب، کیا کوئی بھی نہیں بولنا چاہتا؟"

شری چیما نے جیب سے منیوری چھالیہ نکالی۔ شری منیار اور شری ناڈگیر نے ان کے آگے ہتھیلیاں پھیلا دیں۔ کسی کے بھی بولنے کے آثار دکھائی نہ دینے پر شری رانگنے کرنے ہنستے ہوئے کہا۔

" جناب صدر رنج و غم کے جذبات کی وجہ سے تمام لوگوں کے گلے رندھ گئے ہیں۔ اس لئے آپ تجویز پاس کر دیجئے"۔

سب لوگ اس بات پر ہنس پڑے۔

" سیریس"۔ شری پرانجپے نے خفا ہوتے کہا۔" اٹ از ناٹ فیئر۔ سب کی تقریروں کے بعد ہونے والی اختتامی تقریر بھی تیار کر کے لایا ہوں"۔

دو منٹ اور گزر گئے مگر کوئی نہ اٹھا۔ پھر نہایت بیچارگی کے عالم میں شری پرانجپے خود اٹھے۔" اب تو شاید شری رانگنے کر کے کہنے پر ہی عمل کرنا پڑے گا"۔

شری ناڈگیر نے آہستہ سے کہا۔" جب کوئی بھی تقریر نہیں کر رہا ہے تو اختتامی تقریر کی کیا ضرورت ہے۔ بس، تجویز پاس کر دو"۔

شری پرانجپے نے ویسا ہی کیا۔" میں جو تجویز لکھ کر لایا ہوں وہ پڑھ کر سناتا ہوں پھر ہم سب اسے اتفاق رائے سے پاس کر دیں گے۔ ذرا توجہ سے سنئے"۔

انھوں نے تجویز کا کاغذ سامنے رکھا۔

" ہمارے آنند کلب کے سابق صدر شری ستیہ دان کھوٹے جی بڑے شریف اور

نیک انسان تھے۔ ان کا چال چلن، نیکی اور ایمان داری مثالی تھی۔ انھوں نے اپنے کلب کے لئے بہت سی تکلیفیں برداشت کیں اور کلب کی عزت و توقیر بڑھائی ان کی موت سے کلب یتیم ہو گیا ہے۔ اس تجویز کے ذریعے کلب ان کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ ایشور ان کی آتما کو شانتی دے"۔

شری رانگنے کر منمنائے۔ "تجویز ذرا لمبی ہو گئی ہے"۔

"تو میں کیا کروں۔ ایسی تجویز تو لمبی ہوتی ہی ہے"۔ پھر سب کی طرف دیکھتے ہوئے شری پرانجپے کہنے لگے۔ "یہ تجویز میں لکھ کر لایا ہوں۔ کسی کو اس میں ترمیم کرنی ہو یا مرحوم کو مزید تعظیم عطا کرنی ہو تو مہربانی کر کے کھڑے ہو جائیں"۔

گھڑی میں چار بج کر پینتالیس منٹ ہو گئے مگر کوئی نہ اٹھا۔ شری کالے نے کہا "کسی کی کوئی تجویز نہیں"۔

"ٹھیک ہے"۔ شری پرنجپے نے کہا۔ "اب ہم اس تجویز پر ووٹ لیں گے۔ شاید کسی کو اختلاف نہ ہو پھر بھی....."

شریمتی داتار بولیں۔ "لحی تعزیتی تجویز تو ایک رسم ہے اس پر رائے شماری کیا"

"ہاں۔ لیکن ہر کام قاعدے سے ہونا چاہئے"۔ شری پرانجپے نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "پھر بعد میں کوئی اعتراض نہ اٹھائے ہاں تو حضرات! آپ سب لوگ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر اس تجویز کی منظوری دیں"۔ انھوں نے تمام لوگوں پر نظر ڈالی۔ کسی نے پورا ہاتھ کسی نے آدھا ہاتھ اور کسی نے ایک انگلی اوپر کر رکھی تھی مگر شری منیار بے نیاز تھے۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھے کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔

"مسٹر منیار ہاتھ اوپر کیجئے نا"۔

"جناب صدر"۔ شری منیار نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "مجھے تھوڑا سا اختلاف ہے"

"کیا کہا اختلاف ہے؟"۔ سب نے اونچی آواز میں کہا۔

"چاہے تو اختلاف سمجھئے۔ اس تجویز میں بالکل سچ ہی بولنا ضروری ہے یا جھوٹ بھی۔ اگر سچ ہی....."

"ٹھہریئے مسٹر۔" شری رانگنے کرنے کہا۔ "پہلے صاحب صدر کو ہمیں ہاتھ نیچے کرنے کے لئے کہنے دیجئے پھر اپنی تجویز پیش کیجئے"۔

سب لوگ ہنسے مگر شری پرانجپے اپنے خیالوں میں گم تھے۔

"بس۔ بس۔ ہاتھ نیچے کرلیجئے"۔

شری چیمانے آرڈر دیا "ہینڈز ڈاؤن"۔

سب خوب ہنسے۔ شری پرانجپے نے شری منیار سے پوچھا۔ "مسٹر منیار آپ کی تجویز کیا ہے؟"

شری منیار نے کہا۔ "میرا کہنا یہ ہے کہ اس تجویز میں آپ نے کہا ہے کہ ستیہ دان کھوٹے جی کا چال چلن اور ایمانداری مثالی تھی، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے ان کھوٹے جی نے میرے باس کے بیس ہزار روپے ہڑپ کرلئے تھے....."

شریمتی داتار نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "مسٹر منیار تعزیتی تجویز تو صرف ایک فارمیلیٹی ہوتی ہے"۔

"ٹرو"۔ شری منیار نے سمجھاتے ہوئے کہا"۔ بٹ اٹ از اے کوئسچن آف سروس۔ یہ تجویز اخباروں میں شائع ہوگی اور اسے پڑھ کر میرے باس میری کھال کھینچ لیں گے کہ آپ کلب کے ممبر ہیں، کھوٹے جی نے میرے بیس ہزار روپے ہڑپ کرلئے یہ آپ کو معلوم ہے پھر بھی آپ نے ایسی تجویز پاس کی"۔

"تو آپ ایسا کیجئے مسٹر منیار"۔ شری کالے نے رائے دی۔ "آپ اپنے باس کو کہہ دیجئے کہ یہ محض دکھاوا ہے ویسے بھی ہم کہاں سنسیئر ہیں"۔

"تو ایسا کیجئے کہ یہ تجویز اخباروں کو بھیجئے ہی نہیں"۔

شری پرانجپے کی جان نکل گئی۔ "نہیں نہیں۔ اخباروں میں یہ تجویز بھیجنا ہی چاہیئے۔ اس سے ہماری اور ہمارے کلب کی پبلسٹی ہوگی۔ ایسی تجاویز پاس کرنے والوں کو سماج میں عزت ملتی ہے"۔

"اور آلٹرنیٹو"۔ شری منیار نے کہا۔ "میں باہر جاتا ہوں پھر آپ لوگ جو مرضی

میں آئے تجویز پاس کیجئے"۔

"تو پھر یہ تجویز پاس ہی مت کیجئے"۔

"پھر بھی ناک کٹے گی۔ تجویز پاس کرنے آئے اور پاس کئے بغیر ہی چلے گئے۔ اس کا مطلب؟"

شری منیار کا پارہ چڑھ گیا۔ "یہ تو ظلم ہے۔ تجویز کا ایک جملہ جھوٹ ہوتے ہوئے میں اس کی حمایت کیسے کروں؟ میں باہر بھی نہ جاؤں۔ تجویز اخباروں کو بھی ضرور بھیجنی ہے یعنی میرے باس میری حجامت کریں"۔

شری پرانجپے چیخے۔ "کوئی نہیں حجامت کرے گا۔ آپ ٹوپی پہن کر چلے جایئے گا"

سب ہنس پڑے مگر شری منیار کا پارہ چڑھتا ہی گیا۔

"دیکھو بھائی خاوند کیسا ہے یہ تو بیوی ہی ٹھیک بتا سکتی ہے۔ میرا باس کیسا ہے۔ یہ تو میں ہی جانتا ہوں۔ آگ ہے آگ"۔

سب سنجیدہ ہو کر سوچنے لگے۔ اتنے میں شری کالے نے مشورہ دیا۔ "آپ کا اختلاف ان کے چال چلن اور ایمان داری کے بارے میں ہے نا۔ اس جملے کو نکال دیجئے"۔ لیکن شری پرانجپے کو یہ بات منظور نہیں تھی۔ "نہیں نہیں یہ نہیں، ہو سکتا"۔

شری ناڈگیر بیٹھے بیٹھے اکتا سے گئے۔ "لیواٹ مسٹر پرانجپے"۔

بادل نخواستہ شری پرانجپے نے قلم اٹھایا اور وہ جملہ کاٹ دیا۔ ان کی شکل ایسی ہو گئی تھی جیسے ان کے دل کا ٹکڑا ہی کسی نے کاٹ دیا ہو۔

شری رانگنے کر بے چین ہو کر ایک دم بول اٹھے۔ "مسٹر پرانجپے میں کچھ بولنا چاہتا ہوں۔ "یس مسٹر رانگنے کر"۔

"شری منیار نے جب سچ بولنے کی ٹھانی ہے تو میں بھی کیوں پیچھے رہوں۔ اس تجویز میں آپ نے انہیں اچھے چال چلن کا اور شریف انسان کہا ہے اس سے میرا اختلاف ہے"۔

"رانگنے کر جی" ۔ شریمتی داتار سمجھانے لگیں "۔ ماتمی تجویز صرف فارمیلیٹی ہوتی ہے "۔

"یس مسز داتار لیکن جو سفید جھوٹ ہے اسے میں کبھی نہیں مان سکتا"۔

"سفید جھوٹ؟"

"آپ نہیں جانتے کہ انہی کھوٹے جی نے کالج میں میری مسز کا ہاتھ پکڑ لیا تھا..."۔

"چھوڑیئے بھی" شری چیما نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا لیکن شری رانگنے کر کا دماغ تپتا ہی گیا۔ " ان کی باتیں سنانے بیٹھوں تو شاید ایک کتاب بن جائے ۔ شریمتی ساوی، کماری بھاگوت، شریمتی موہنی اور...."

"بس بس ۔ اب گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ؟" شری کالے نے کہا لیکن شری رانگنے کر اپنی ضد پر اڑے رہے۔ " اگر یہ تجویز میری شریمتی نے دیکھ لی تو وہ مجھے پریشان کریں گی اور اگر میں نے انھیں سمجھا بھی لیا تو وہ جس اسکول میں پڑھاتی ہیں وہیں کماری بھاگوت اور شریمتی موہنی ہیں ۔ ان کے ہاتھوں میں یہ تجویز پڑ گئی تو اصلیت کا ڈھنڈورا پیٹ دیں گی ۔ کہیں گی کہ اس کلب کے لوگ اتنے بے شرم ہیں کہ شری کھوٹے کو شریف اور نیک کہتے ہیں "۔

شری منیار کا پلہ اب بھاری ہو گیا۔ "میں آپ سے متفق ہوں شری رانگنے کر جی "

شری کالے نے حیران ہو کر پوچھا۔ " پھر کیا کیا جائے؟"

"سو وہاٹ؟ شری منیار کی طرح بھی میرا بھی یہی خیال ہے کہ اس تجویز میں کھوٹے جی کی فضول تعریف کی گئی ہے۔ گیٹ اٹ شارٹ"۔

" تو پھر کیا یہ تجویز رد کر دی جائے؟ نہیں نہیں ۔ تجویز تو پاس ہونی ہی چاہئے۔ ماتمی جملے اس میں ضرور ہوں گے "۔ شری پرانجپے نے بلند آواز میں کہا۔

شری کالے نے پھر ٹانگ اڑائی ۔ " پھر ایسا کیجئے کہ پہلے کی طرح یہ جملہ بھی قلم زد کر دیجئے "۔

"پھر بچا ہی کیا؟" ۔ شری پرانجپے نے پوچھا۔

"اس سے ہمیں کوئی مطلب نہیں۔" شری رانگنے کرنے واضح کیا۔ "جھوٹی تجویز پاس کرنے سے اچھا یہ ہے کہ چھوٹی سی ہی سہی ایسی تجویز پاس کی جائے جو سچ پر مبنی ہو"۔

شری پرانجپے کی سانس اوپر نیچے ہونے لگی۔ اب انھیں قلم اٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ شری کالے نے تجویز کا کاغذ اپنے پاس کھینچ لیا۔ "کہاں ہے؟ ہاں یہ رہا۔ یہاں سے یہاں تک یہ جملہ میں کاٹ دیتا ہوں"۔

شری مینار اور شری رانگنے کر خوش ہو گئے۔ "ہاں بہت اچھا۔ ذرا ایک بار پھر پڑھئے تو"۔

"ہمارے آنند کلب کے سابق صدر شری ستیہ دان کھوٹے جی ۴ ستمبر ۱۹۶۸ء کو انتقال کر گئے۔ انھوں نے اپنے کلب کے لئے بہت سی تکلیفیں برداشت کیں اور کلب کی عزت و توقیر بڑھائی۔ ان کی موت سے ہمارا کلب.... یتیم ہو گیا ہے۔ اس تجویز کے ذریعے یہ کلب ان کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ ایشور ان کی آتما کو شانتی دے"۔

شری رانگنے کر خوش ہو کر بولے۔ "منظور ہے۔ اب بھیج دو اخباروں کو"۔

لیکن شری چیما کی شاید تسلی نہیں ہوئی تھی۔ "ایک منٹ شری کالے۔ یتیم میینز وہاٹ؟ مائی ہندی از ویک"۔

"اس کا مطلب۔ دیٹ وی فیل آرفن"۔

"نان سینس"۔ شری چیما چلائے۔ "وی ڈونٹ فیل دیٹ وے۔ کون اپنے آپ کو آرفن سمجھنے لگا ہے کسی کام میں ڈیفیکلٹی آئی ہے۔ برج، پنگ پانگ، بیڈمنٹن، کلب کے سبھی کھیل اور پروگرام ٹھیک طریقے سے چل رہے ہیں"۔

شریمتی داتار نے پھر کہا۔ "مسٹر چیما یہ تو محض فار میلیٹی ہے"۔ لیکن اس پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ شری منیار کو پھر غصہ آگیا۔ "کیسی خدمت اور کہاں کی عزت؟ ان کو تو ہم لوگوں نے صدر کے عہدے سے ہٹایا تھا"۔

"بالکل ٹھیک"۔ شری چیمانے کہا۔ "جب وہ صدر تھے تو انہوں نے کلب کے فنڈ میں غبن کیا۔ اسی لئے تو ہم نے اتفاق رائے سے انھیں صدر کے عہدے سے ہٹایا اور شری پرانجپے کو صدر بنایا"۔

"شری چیمانے ٹھیک ہی کہا ہے"۔ شری رانگنے کر بولے۔ "شری کھوٹے نے کلب کی کیا بھلائی کی ہے بلکہ جب سے وہ گئے ہیں تب سے کلب کی حالت بہتر ہو گئی ہے تن از ساری"۔

شری پرانجپے اپنی تعریف سے خوش ہو گئے۔ "وہ تو ٹھیک ہے مگر ہمارے صدر چلے گئے تو کچھ اچھی باتیں بھی کہنی چاہئیں"۔

"لیکن سچ بولنے پر اصرار کون کر رہا ہے؟ کیا ضرورت ہے تجویز کی؟"

شری پرانجپے کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ انھوں نے طیش میں کہا۔ "شری منیار یہ سب صرف آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ آپ نے ہی خبریں دینا شروع کیں"۔

"پر میں کہاں کہہ رہا ہوں کہ کوئی میری خبر پر یقین کرے۔ میں چلا۔ آپ کی جو مرضی آئے کیجئے"۔

شری کالے اکتا گئے۔ "شری پرانجپے سچ تو یہ ہے کہ کلب کی بھلائی کے لئے ہم شری کھوٹے کی تعریف نہیں کر سکتے۔ ان کے وقت میں کلب کے اکاؤنٹس میں اتنی گو بڑ ...."

"اف! ان کے انتظام کا نہ سر تھا نہ پیر"۔ شری رانگنے کرنے کہا۔ "کیا کھچڑی پکا رکھی تھی انہوں نے پرانجپے صاحب نے سب درست کیا ہے"۔

اپنی تعریف سن کر شری پرانجپے پھول گئے"۔ سبھی مخالفت کر رہے ہیں۔ اسی لئے میں یہ جملہ بھی کاٹ دیتا ہوں۔ پھر دیکھئے تجویز کیسی ہے"۔

"ہمارے آنند کلب کے سابق صدر شری ستیہ دان کھوٹے ۴ ستمبر ۱۹۶۸ء کو انتقال کر گئے۔ اس تجویز کے ذریعے یہ کلب ان کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ ایشور ان کی آتما کو شانتی دے"۔

شری چیمانے جمائی لی۔"اچھا اب جلدی کیجئے۔ سبھی کو جانا ہے۔ مجھے مس پیٹنج کا ناچ دیکھنے جانا ہے"۔

شری کالے نے تجویز پھر سے لکھنے کے لئے سادہ کاغذ نکالا۔ شری ناڈگیر زور سے ہنسے۔"یہ سب بڑا دلچسپ معلوم ہوتا ہے"۔

مسٹر ناڈگیر آپ کیوں ہنسے؟"

"کیونکہ یہ سب بڑا مضحکہ خیز ہے"۔

"کیا ہے مضحکہ خیز؟"

شری ناڈگیر ٹھیک سے بیٹھ گئے۔ باہر کی جھاڑیوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔"بھائی میں تو اس کلب میں ابھی ابھی آیا ہوں۔ شری ستیہ دان کھوٹے کا نام میں نے پہلے نہیں سنا لیکن اتنی دیر آپ لوگوں نے جو تو تو میں میں کی...."

"کیا کہا تو تو میں میں....؟"

"چاہیں تو آپ اسے ذکر کہہ سکتی ہیں لیکن جو کچھ کہا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ میں سے کسی کے دل میں بھی ان کے لئے عزت نہیں ہے۔ ان کی کسی بات کو کسی نے بھی پسند نہیں کیا"۔

شری پرانجپے چلائے۔"تو پھر کیا؟"

"کیا کیا؟"۔ شری ناڈگیر نے کہا۔"جس آدمی میں خوبیاں ہوں اس کے مرنے پر دکھ کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں کسی کے دل میں بھی ان کے لئے عزت نہیں ہے پھر اظہار رنج کی کیا ضرورت؟"

شریمتی داتار نے ترس کھا کر کہا۔"ناڈگیر جی یہ تعزیتی تجویز ہے اور تعزیتی تجویز تو محض ایک فارمیلیٹی ہوتی ہے"۔

شری چیمانے شریمتی داتار کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے کہا۔"شاباش مسٹر ناڈگیر۔ اٹ از لائک برنارڈ شا"۔

"اور نہیں تو کیا۔ فضول دکھاوا"۔

"کیا دکھاوا؟"

"ابھی تو آپ نے کھوٹے کو برا بھلا کہا ہے اور اب دکھ کا اظہار کر رہے ہیں"۔

"پھر کیا شری کالے؟"

"وہ اظہار رنج والا جملہ نکال دیجئے اور وہ ایشور کی پرارتھنا بھی نہیں چاہئے۔ ایشور انہیں سورگ بھیجے یا نرک ہمیں اس سے کیا مطلب؟ اس طرح تجویز چھوٹی ہو جائے گی اور اخبار والے ہم تمام لوگوں کے نام اور پوری تجویز چھاپ دیں گے۔" شری منیار کے ساتھ سبھی لوگ ہنس دیئے۔

"بڑا اچھا خیال ہے۔ ویسے بھی شری رانگنے کرنے پہلے کہا ہی تھا کہ تجویز لمبی ہے کاٹ دیجئے وہ جملہ"۔ زور زور سے ہنستے ہوئے رانگنے کرنے کہا۔

"میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں"۔ شری پرانجپے نے کہا۔ "مگر پھر تجویز میں باقی کیا رہ گیا؟"

شری کالے نے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "میں بتاتا ہوں کیا باقی رہا۔ سنئے۔ ہمارے آنند کلب کے سابق صدر شری ستیہ دان کھوٹے کا ۴ ستمبر ۱۹۶۸ء کو انتقال ہو گیا ہے"۔ وہ خود بھی اپنی ہنسی نہ روک سکے۔

"جب تجویز چھوٹی ہو گئی تو اتفاق رائے سے پاس ہو جانی چاہئے"۔

شری پرانجپے کے سر میں جیسے درد ہونے لگا۔ بولے۔ "لیکن بچ ہی کیا گیا؟"

مگر ان کی بات پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔

"اب تو کر دو تجویز پاس"۔ شریمتی داتار نے جھوٹی خفگی کے ساتھ کہا۔ "ماتمی تجویز صرف فارمیلیٹی ہوتی ہے لیکن یہاں تو الٹا معاملہ ہے"۔

شری رانگنے کرنے بھی جھوٹی سنجیدگی سے کہا۔ "ناٹ دیٹ وے انڈین پینل کوڈ کا یہی دستور ہے۔ سوچی باتیں نہ لکھیں تو کوئی بات نہیں مگر ایک بھی جھوٹ نہیں ہونا چاہئے"۔

شری کالے اب شری پرانجپے سے بھی آگے نکل گئے۔ "تو ہوئی کہ نہیں یہ تجویز

پاس ؟"

شری پرانجپے نے لال پیلے ہوتے ہوئے کہا۔" شری کالے ۔صدر میں ہوں آپ نہیں "۔

" ضرور ضرور " شری کالے نے تجویز کا کاغذ ہاتھ میں اچھی طرح پکڑ کر کہا۔" کون منع کر رہا ہے ۔صرف ممبروں سے پوچھ ہی تو رہا ہوں ۔سو حضرات اب تجویز سنئے ۔ ہمارے آنند کلب کے سابق صدر شری ستیہ دان کھوٹے کا ۴ ستمبر ۱۹۶۸ء کو انتقال ہو گیا"۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ہی از ڈیڈ " ۔سب ایسے چلائے جیسے کوئی میچ جیت لیا ہو۔
شری کالے نے کاغذ کو موڑ دیا۔" چلو اچھا ہوا ۔اجلاس کی رپورٹ لکھنے میں دقت ہوتی "۔

" اور کیا ؟ " ۔شریمتی داتار نے اٹھتے ہوئے کہا۔" میں تو پہلے ہی سے کہہ رہی تھی کہ ماتمی تجویز محض فارمیلیٹی ہوتی ہے مگر عورتوں کی کوئی سنے تب نا "۔

سب لوگ اٹھے مگر شری پرانجپے حیران سے بیٹھے ہی رہے۔

"چلئے شری پرانجپے ۔اجلاس ختم ہو گیا۔ تجویز پاس ہو گئی " ۔کسی نے کہا۔
اب ان سے رہا نہ گیا۔بولے ۔" میں تجویز اتنی محنت سے لکھ کر لایا تھا لیکن آپ لوگوں نے میری محنت مٹی میں ملا دی "۔

" نہیں پرانجپے صاحب " ۔شری کالے نے سمجھایا۔" جو تجویز پاس ہوئی ہے وہ آپ ہی کی ہے ۔کچھ جملے ضرور کاٹے گئے ہیں مگر یہ تو ہوتا ہی ہے ۔تجویز اتفاق رائے سے پاس ہو گئی یہی سب سے اہم بات ہے " ۔شری پرانجپے کی صورت رونی سی ہو گئی ۔اداس نظروں سے انھوں نے ایک بار سب کو دیکھا اور پھر اپنی جانب نظر کی ۔کالی پینٹ ، کالا کوٹ ، کالی ٹائی ۔انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کپڑوں پر مٹی کے دھبے پڑ گئے ہوں ۔

ایس۔این۔منشی

(ہندی)

شاعر کا عشق

گیارہویں صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائی کی بات ہے۔ایران کے ترک حکمرانوں کی سلطنت تیزی کے ساتھ وسیع سے وسیع تر ہو رہی تھی۔شام کے ایک بڑے حصہ پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا اور اب نوجوان بادشاہ ملک شاہ شمالی شام کے مشہور شہر الیپو کو اپنا مستقر بنا کر بیت المقدس کو فتح کرنا اور پھر مصر کے خلیفہ کو اپنے دائرہ اثر میں لانا چاہتا تھا لیکن بیت المقدس پر حملہ کرنے سے پہلے اسے کافی دنوں تک الیپو میں قیام کرنا پڑا کیونکہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے فوجی تیاری ضروری تھی۔

اپنے وقت کا مشہور ریاضی داں ماہر علم نجوم اور شاعر عمر خیام بھی فوج کے ساتھ تھا کیونکہ وہ شاہی نجومی ہونے کے ساتھ ساتھ ملک شاہ کا قریب ترین ساتھی بھی تھا۔علم نجوم پر بہت زیادہ اعتقاد نہ ہونے کے باوجود ملک شاہ نے اپنا زائچہ عمر خیام سے بنوایا تھا اور وہ جب بھی کوئی اہم کام شروع کرتا تو خیام سے اس سلسلے میں تفصیلی مشورہ ضرور کرتا۔چونکہ الیپو میں شاہی افواج کو کافی عرصہ تک رہنا پڑا اور اس عرصہ میں خیام کے ذمہ کوئی اہم کام نہیں تھا اسی لیے وہ اپنا زیادہ وقت ادھر ادھر گھومنے میں گزارتا تھا۔اسی سیر و تفریح کے دوران ایک دن اس کی ملاقات ایک یونانی تاجر سے ہو گئی جو اس کا پرانا واقف کار تھا۔اس یونانی تاجر سے ملاقات کے بعد یاسمین کی یاد اس کے دل میں تازہ ہو گئی۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اسے بھول چکا تھا بلکہ دو ڈھائی

سال سے شاہی فوج کے ساتھ ساتھ پھرتے رہنے کے باعث وہ اپنے دردِ دل کی طرف سے کچھ غافل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ مشہد کے تاجر زید کے ساتھ شادی ہو جانے کے باعث یاسمین کا کوئی پیغام بھی تو نہیں آیا تھا۔ یونانی تاجر کو دیکھ کر خیام نے سوچا کہ چونکہ یہ اپنے تجارتی کام کے سلسلے میں مختلف شہروں اور ملکوں کو جاتا رہتا ہے اس لیے اسے زید کے بارے میں کچھ نہ کچھ علم ضرور ہوگا۔ لہٰذا رسمی باتوں کے بعد خیام نے اس سے زید کے بارے میں دریافت کیا۔ یونانی تاجر نے بتایا کہ تقریباً دو سال قبل زید اپنی نئی نویلی بیوی کے ساتھ الیپو آیا تھا اور کئی مہینے یہاں قیام بھی کیا تھا۔ لیکن بعد میں وہ ایران یا کہیں اور چلا گیا اور آج تک واپس نہیں آیا۔ اس خبر نے خیام کے دل کے زخموں کو پھر سے ہرا کر دیا۔ اس کے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوتا کہ زید یہیں ہوگا اس کے دل کی گہرائیوں سے آواز آئی۔ "الیپو میں ہی تلاش کرو۔ تمہیں زید کا خاندان کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گا۔ ایسے میں تم یاسمین سے بھی مل سکو گے، اور تمہیں یہ معلوم ہو سکے گا کہ اس کے دل میں اب تمہارے لیے کوئی جگہ ہے یا نہیں"۔ اس کے بعد وہ اپنی محبوبہ کی تلاش میں دیوانوں کی طرح لگ گیا۔ کئی دنوں تک نہ تو اسے ریاضی کا کوئی ہوش رہا اور نہ نجوم کا۔ اس کا پورا وجود اپنی محبوبہ میں مرتکز ہو چکا تھا۔

نیشاپور میں ان کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب یاسمین کی عمر مشکل سے تیرہ سال تھی اور خیام کی سترہ سال۔ اس وقت وہ مسجد سے ملحق مدرسہ کا طالب علم تھا وہ اکثر یاسمین کے والد کی کتابوں کی دوکان میں جا کر گھنٹوں کتابیں پڑھا کرتا تھا کیونکہ غربت کے سبب کتابیں خریدنا اس کے بس میں نہ تھا۔ یاسمین الماری سے کتابیں نکال کر گاہکوں کو دیا کرتی تھی اس لیے کہ اس کے والد کافی بوڑھے تھے اور انہیں کتابیں فروخت کرنے سے زیادہ خود پڑھنے میں دلچسپی تھی۔ اس کے علاوہ شہر کے فوارے یا تالاب پر بھی وہ اکثر ملا کرتے جہاں یاسمین پانی لانے کے لیے جایا کرتی تھی۔ جب بھی وہ ملتے دنیا سے بے نیاز ہو کر ملتے۔ آخرکار ایک دن انہوں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ وہ دونوں آئندہ زندگی سماجی طور پر ایک ہو کر گزاریں گے۔

خیام ماضی کی یادوں میں کھویا ہوا الیپو کی جامع مسجد کے قریب سے گزر رہا تھا کہ یکایک رک کر وہ تمام آنے جانے والوں کا جائزہ لینے لگا۔جمعہ کا دن تھا اور شہر کے تمام چھوٹے بڑے لوگ نماز ادا کرنے کے لیے مسجد کی طرف آرہے تھے ۔ خیام نے سوچا کہ شاید انہی لوگوں میں اسے کہیں زید دکھائی دے جائے لیکن زید اسے کہیں دکھائی نہ دیا پھر تالاب کے کنارے جا کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا کہ چاروں طرف سے فقیروں کے ہجوم نے اسے گھیرے میں لے لیا ۔ اس کی نگاہ اچانک ایک کبڑے اور لنگڑے فقیر پر پڑی جس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا وہ خیرات دینے والی عرب خاتون سے کہہ رہا تھا کہ ۔

" یہ روٹی میں ایک ایسی عورت کے لیے لے جا رہا ہوں جو دن رات خون کے آنسو روتی رہتی ہے " ۔ پھر اس فقیر نے خیام کی طرف دیکھا اور دیکھتے ہی ان کے قریب آگیا ۔

" میرے آقا آپ اتنے دنوں کہاں رہے ؟ "

" ظفر! تم یہاں ؟ " ۔ خیام نے بلند آواز میں پوچھا اور اسے یاد آیا کہ کسی زمانے میں یہ کبڑا موجودہ بادشاہ ملک شاہ کے والد شہنشاہ ارسلان کا منہ چڑھا غلام تھا اور چند برسوں پہلے جب ان کا انتقال ہوا تھا تو اس نے رو رو کر اپنا جی ہلکان کر لیا تھا ۔ کبھی کبھی خیام نے اس کے ذریعہ یاسمین کو پیغام بھی بھجوائے تھے ۔ ان یادوں کے باوجود خیام کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ شاہی مسخرا اس قابل رحم حالت کو کیسے پہنچ گیا ۔ ؟

" جی ہاں حضور! میں ظفر ہوں جسے آپ بھکاریوں کے ہجوم میں دیکھ رہے ہیں ۔ لیکن میرے آقا آپ نے مجھے بلوایا کیوں نہیں ؟ کیا آپ مجھے بھول گئے ؟ آپ کا دیا ہوا چاندی کا بازو بند میں نشانی کے طور پر آپ کے دولت خانے پر چھوڑ آیا تھا ۔ اس میں کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی تھا ۔ کافی دنوں تک جب آپ کی جانب سے کوئی پیغام نہیں آیا تو ناامید ہو کر مجبوراً میں الیپو واپس آگیا ۔ ظفر نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا ۔ بات اب بھی کچھ صاف نہیں ہوئی تھی ۔ کیسا پیغام ؟ کیسا بازو بند کیسی ناامیدی ؟ خیام صرف " ہوں " کہہ کر پھر اس کی طرف دیکھنے لگا ، جیسے کہہ رہا ہو ۔ " ہاں ہاں! کہے جاؤ ۔ میں سن رہا ہوں اور یاد کرنے کی کوشش بھی کر رہا ہوں " ۔

کچھ اور قریب آکر ظفر نے کہا۔ "شروع میں کچھ دنوں تک وہ تندرست رہی کبھی کبھی ہنس بول بھی لیتی تھی۔ وہ ہمیشہ یہی کہتی رہی کہ آپ ایک نہ ایک دن آئیں گے ضرور۔ وہ ہر نماز کے بعد یہی دعا کرتی تھی کہ آپ جلد سے جلد آجائیں۔ میرے اچھا آقا۔ کیاآپ کو اس کی یاد بالکل نہیں آتی ہے؟"

خیام کا دل جیسے رو پڑا۔ اس نے اپنے جذبات کو قابو میں کرتے ہوئے پوچھا۔ "وہ اب بھی یہیں ہے؟"

ظفر نے اپنے دوسرے ہاتھ کی روٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بھیک میں اسی کے لیے تو مانگتا ہوں اور ساتھ ساتھ اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے ہر شخص کو گھور گھور کر دیکھتا رہتا ہوں کہ شاید آپ کہیں نظر آجائیں"۔

خیام نے کچھ اور نہیں پوچھا۔ "مجھے اس کے پاس لے چلو"۔ اس نے کہا اور ظفر اس کے گھوڑے کی نکیل پکڑ کر چل پڑا۔ ایک ٹوٹے پھوٹے دو منزلہ مکان کے سامنے رک کر اس نے خیام سے کہا۔ "آپ ذرا ٹھہریے میں پہلے اسے اطلاع دیدوں کہ دیکھ خداوند تعالیٰ نے تیرے لیے کیا سوغات بھیجی ہے"۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے مکان کے اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ مسکراتا ہوا واپس آیا اور بولا۔ "ابھی صبح تک تو وہ ذبح کی ہوئی چڑیا کی مانند پڑی تھی لیکن میری بات سنتے ہی پھڑپھڑانے لگی جیسے آسمان کے نیچے کہیں رکے گی ہی نہیں۔ کھانے کے لیے روٹی کا گھر میں ایک ٹکڑا نہیں اور استقبال کے لیے سولہ سنگھار کرنے کی حسرت اس کے دل میں ہے"۔

مکان کے گیلے بدبو دار برآمدے سے ہوتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر جب وہ اوپر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ کوٹھری کے ایک کونے میں وہ ایک ٹاٹ کی بوری پر پڑی ہے۔ اس کا جسم نقاہت سے زرد پڑ گیا تھا۔ خیام نے ایک ہی نظر میں سب کچھ دیکھ لیا اور پھر اس کی آنکھوں پر نظریں جما دیں جن میں اب بھی تازگی موجود تھی۔ وہ وہیں زمین پر اس کے برابر بیٹھ گیا اور آہستہ سے کہا۔ "یاسمین! میری جان یاسمین!" اس نے بھی آہستہ آہستہ سے جواب دیا۔ "میرے آقا۔ میرے مالک۔" اور اپنی بانہیں خیام کی گردن میں

حمائل کر کے سسک سسک کر رونے لگی۔ خیام نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر یاسمین نے ضبط سے کام لے کر کہا۔ "میرے عمر! تم تو ان تمام ستاروں سے بخوبی واقف ہو۔ ان میں کسی سے بھی پوچھ سکتے ہو۔ میں ان سے پوچھتی رہتی تھی کہ تم کہاں ہو؟ کیسے ہو؟۔ میں ان سے کہتی تھی کہ تم جہاں بھی ہو یہ تمہیں ہمارا حال بتا دیں۔ ظفر سے معلوم ہوا کہ تم شہنشاہ کے وزیر ہو گئے ہو اور اب بڑے آدمی بن گئے ہو تو۔" وہ رک کر سونے چاندی سے لدے ہوئے خیام کے جسم کو اپنی کھردری انگلیوں سے ٹٹولنے لگی۔ اس کے بعد وہ مسکرائی لیکن فوراً ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "میں اب تمہارے کس لائق ہوں؟ تمہاری اس کنیز کے پاس تو اب کچھ بھی نہیں رہ گیا کچھ بھی نہیں"۔

"نہیں میری جان۔ تم اب بھی اتنی ہی حسین ہو جتنی کہ پہلے تھیں پھر عشق کی اصل پہچان تو اب ہو سکتی ہے جب میرے سوا کوئی دوسرا عشق کا دعویٰ نہ کر سکے"۔ خیام نے جذبات بھری آواز میں کہا اور جھک کر اس کے ہونٹوں کو چوم لیا وہ کچھ شرما سی گئی پھر بولی۔ "تم نے شادی کی یا نہیں؟ تمہاری بیوی کیسی ہے؟ بہت خوبصورت ہو گی۔ ہے نا؟ اور تمہارے پاس تو کنیزیں بھی ہوں گی۔ کیوں؟"

"میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ میرے دل سے تمہاری یاد ذرا بھی کم نہیں ہوئی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ تم مجھے ملو گی۔ ضرور ملو گی۔ میرے پاس جب ایک روشن چاند ہے تو میں ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کی خواہش کیوں کروں؟"

وہ شوخی کے ساتھ مسکرائی۔ "یہ تو شاعری والی بات ہوئی ورنہ تم تو حساب لگا کر کہا کرتے تھے کہ اتنا بڑا نظر آنے والا چاند ستاروں کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ کتنے ہی ستارے اس سے بہت بڑے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کب تم شاعری کرتے ہو اور کب تحقیق"۔

خیام کچھ جھینپ سا گیا۔ "تمہیں اب بھی میری تمام باتیں یاد ہیں؟"

"کیوں نہیں" ان ہی یادوں کے سہارے تو میں آج تک زندہ ہوں"۔ یاسمین

نے ایک لمبی سانس لے کر کہا اور پھر یہ بتانے لگی کہ اس نے یہ مدت کس طرح گزاری وہ بتا رہی تھی کہ جب گھر میں اس کی شادی کا ذکر نکلا تو اس کا ذہن ایک الجھن میں مبتلا ہو گیا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ خیام تک پیغام پہنچوانے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اسے گھر میں قید کر دیا گیا تھا۔ پھر نکاح ہو جانے کے بعد جیسے ہی زید نے اسے اپنی باہوں میں لیا تو وہ جیسے کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو گئی۔ اس کے بعد سے وہ بیمار رہنے لگی۔

.... زید اسے محمل میں بٹھا کر نہ جانے کہاں کہاں لیے پھرا۔ آخر ایک دن جب وہ کسی پہاڑی سرائے میں ٹھہری ہوئی تھی تو اتفاق سے اسے ظفر نظر آ گیا اور اس نے اس کے ذریعہ اپنا چاندی کا بازو بند اور ایک خط نیشاپور بھجوایا لیکن وہاں سے کوئی جواب نہ آیا۔ ایسے میں زید کی خفگی زیادہ بڑھ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ بیماری محض ایک بہانہ ہے۔ اس کا غصہ اتنا بڑھا کہ ایک دن اس نے چند گواہوں کو جمع کر کے اسے طلاق دیدی اور پھر اسے چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔

خیام سب کچھ بڑے غور سے سنتا رہا پھر بولا۔ "میری نظر میں تم اب بھی غیر شادی شدہ ہو۔ تمہاری شادی تو اب ہونی ہے۔ تمہارا کوئی پیغام مجھے نہیں ملا ورنہ اتنا وقت نہ لگتا۔ گزری ہوئی باتوں کو یاد کرنے سے اب کوئی فائدہ نہیں۔ تمہاری شادی ہو گی اور ابھی ہو گی"۔

"لیکن میرے پاس نہ تو جوانی رہی ہے نہ خوبصورتی اور نہ جہیز کے لئے کوئی رقم!"

"میری نگاہ سے دیکھو۔ تم اب بھی جوان اور خوبصورت ہو۔ رہی جہیز کی بات تو تمہاری محبت سے زیادہ قیمتی چیز مجھے اور کیا مل سکتی ہے۔ بس اب چند لمحوں کی دیر ہے اس کے بعد تم میری شریک حیات بن جاؤ گی"۔ یہ کہہ کر وہ مکان سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر اس نے ظفر کے ہاتھ سے گھوڑے کی نکیل لے کر اور چاندی سونے سے بھری تھیلی اسے دے کر گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ظفر تم جا کر مٹھائی لے آؤ۔ میں قاضی

کو لے کر آتا ہوں۔ شام سے پہلے پہلے باجے اور روشنیوں کا بھی انتظام ہو جانا چاہیے اور ہاں تمام خاص و عام کو اس پر مسرت موقع پر شرکت کی دعوت دیدو"۔

شادی کے تمام انتظامات مکمل کر لیے گئے اور مغرب کے فوراً بعد قاضی نکاح پڑھانے کے لیے پہنچ گیا لیکن لوگوں کی چہ میگوئیاں سن کر اس نے خیام سے کہا۔ "حضور! کیا اس مدقوق اور گندی بھکارن سے...."

"قاضی صاحب! اپنی قضا کو دعوت مت دیجئے۔ آپ اپنا کام کیجیے اور اپنی اجرت لے کر یہاں سے روانہ ہو جایئے۔" خیام نے نہایت رعب سے کہا اور قاضی صاحب خاموش ہو گئے۔ پھر انہوں نے کچھ کہے بغیر اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ بولتے گئے اور ان کے پیچھے کھڑا کاتب لکھتا گیا۔ "کتب فروش کی دختر نیک اختر یاسمین"۔ پھر ذرا ٹھہر کر اسنے پوچھا۔ "حضور جہیز میں لڑکی طرف سے کیا دیا جا رہا ہے؟"

"جہیز؟" ۔ خیام کی بھنویں تن گئیں۔ "لکھیے۔ اپنا حسین چہرہ۔ ریشم جیسی سیاہ زلفیں۔ صراحی جیسی نازک گردن، سرو جیسا قد اور ایک ایسا دل جو محبت کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ اب آگے بڑھیئے اور جلدی کیجیے"۔

قاضی نے آگے چل کر پھر سوال کیا۔ "اور حضور! آپ کی طرف سے۔؟" وہ اپنا جملہ مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ خیام نے کہا۔ "میرے پاس جو کچھ ہے وہ حاضر ہے"۔

"لیکن پھر بھی سرکار۔ دستاویز میں تو کچھ ٹھوس صورت میں لکھنا ہوگا"۔ قاضی صاحب نے عاجزی کے ساتھ کہا۔ "اس میں تو صاف صاف رقم، جائیداد، زیورات اور زمین وغیرہ کا ذکر کرنا ہوگا"۔

خیام نے اس بار جھنجھلا کر قاضی سے نہیں براہ راست کاتب سے کہا۔ "لکھو کہ میری ہر وہ چیز جس کی کچھ بھی قیمت ہے وہ سب میں دے رہا ہوں"۔ قاضی صاحب اور کاتب دونوں ہی پریشان سے ہو گئے۔ خیام نے زبان سے کچھ نہیں کہا اور ظفر کے ہاتھ میں رکھی طشتری سے سونے کے کچھ دینار اٹھا کر قاضی صاحب اور کاتب کے ہاتھوں پر رکھدیے اور ڈھیر سارے دینار سامنے کھڑے لوگوں پر اچھال دیے پھر جب گواہوں

کے نام درج کرنے کی باری آئی تو مجمع نے ایک ساتھ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اپنی دعاؤں سے پورے ماحول میں زبردست گونج پیدا کر دی۔

آخر میں نوشہ نے دلہن کو اٹھا کر پالکی کے اندر اس طرح بٹھایا جیسے لڑکیاں گڑیوں کو بٹھاتی ہیں اور پھر سرگوشی کے انداز میں کہا۔" میری جان! خدا کرے میں تمہاری ان آنکھوں کو کبھی بھیگا ہوا نہ دیکھوں" پھر وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ڈیرے میں داخل ہوتے ہی خیام نے یاسمین کے کپڑے تبدیل کروائے۔اس کے چہرے اور پورے جسم کو عرق گلاب سے پونچھا اور خیمے کو مختلف قسم کی خوشبوؤں سے معطر کر دیا وہ چاہتا تھا کہ آرام سے سو کر کئی دن کی تکان دور کر لے لیکن نیند جیسے آنکھوں سے اڑ گئی تھی۔دونوں رات بھر ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے رہے۔خیام نے نہایت جذباتی انداز میں کہا۔" یاسمین! آج کی رات ہم دونوں کی زندگی کے ایک نئے آغاز کی پہلی چاند رات ہے۔یہ رات ہماری بے لوث محبت اور بے پایاں صبر و استقلال سے تخلیق ہوئی ہے۔اس رات کو کوئی فنا نہیں کر سکتا...."

یاسمین نے شوخی سے کہا۔" اور جب آسمان پر پھیلی ہوئی میری لاکھوں سوکنیں تمہیں اپنی طرف کھینچیں گی تو؟"

خیام نے شاعرانہ انداز میں جواب دیا۔" تب میں تم سے کہوں گا کہ میری انگلی پکڑ کر ان تک لے چلو، لے چلو گی نا؟"

یاسمین نے سرد آہ کھینچ کر صرف" کاش" کہا پھر وہ دونوں بڑی سنجیدگی سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دیے اسی دوران انہوں نے جب دیکھا کہ خیمے کے دروازے سے سورج کی کرنیں جھانکنے لگی ہیں اور رات ختم ہو گئی ہے تو خیام نے کہا۔" کوئی بات نہیں سونے کے لیے تو ساری زندگی پڑی ہے۔ہمیں اس نئی صبح کو خوش آمدید کہنا چاہیئے"۔یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پھر کچھ دیر بعد نہا دھو کر تیار ہو گیا"۔کئی روز سے میں نے سلطان کے دربار میں حاضری نہیں دی۔آج ان کے پاس جاؤں گا اور اپنی اس خوشی کی خبر انہیں سناؤں گا۔سوچتا ہوں کچھ عرصہ کے لئے چھٹی لے

کر ہم لوگ نیشاپور چلے جائیں"۔ نیشاپور کا نام سنتے ہی یاسمین کو اپنی زندگی کے وہ دن یاد آنے لگے۔ جب خیام سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی اور پھر نہ جانے کتنی حسین ملاقاتیں۔

خیام کی چھٹی کی درخواست سلطان نے منظور کر لی۔ جب وہ اپنے خیمے میں داخل ہوا اور سجی سجائی دلہن نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کا استقبال کیا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے اپنا شاہی لباس اتارے بغیر ہی خود کو اس کی بانہوں میں ڈال دیا۔

دوپہر سے پہلے ہی وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ایک گھوڑے پر دہری زین کسوا کر خیام نے یاسمین کو اس پر اپنے ساتھ بٹھالیا۔ ظفر اپنے خچر پر بیٹھ گیا اس کے پیچھے دو گھوڑوں پر ضروری سامان لدا ہوا تھا۔ اور چار گھوڑوں پر چار مسلح فوجی سوار تھے۔

یہ مختصر سا کارواں جب فرات کے پاس پہنچا تو کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ رات کے وقت ندی کا پار کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے کہ اس پر جو پل تھا وہ کشتیوں کی مدد سے بنایا گیا تھا اور اسے صرف دن کی روشنی میں ہی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ لہذا رات میں انہیں ندی کے کنارے ہی ڈیرا ڈال دینا پڑا خیمے نصب کر دیے گئے اور سب لوگ کھا پی کر اپنے اپنے خیمے کے اندر سو گئے۔ خیام جب اپنے خیمے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ یاسمین کا چہرہ کچھ پژمردہ سا ہے۔ نزلے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے وہ سردی سے کپکپانے لگی۔ یاسمین پر سرسام کا زبردست حملہ ہو چکا تھا۔ خیام یاسمین کی یہ کیفیت دیکھ کر گھبرا گیا اس نے فوراً ظفر کو بلوایا۔ بے سدھ خاموش پڑی یاسمین کو دیکھنے کے بعد ظفر نے کہا۔
"طاعون ہے"۔

یہ سن کر خیام کی گھبراہٹ میں اور اضافہ ہو گیا اور وہ اضطراری کیفیت میں یاسمین کے ہونٹوں کو چومنے لگا۔ بیچ بیچ میں وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر کہتا جاتا۔
"یاسمین! میری پیاری یاسمین کچھ تو بولو۔ اب تم زید کے شکنجے میں نہیں ہو۔ اپنے عمر

کی گود میں ہو "کاشانۂ انجم" کے در تمہارا انتظار کر رہے ہیں"۔

کچھ دیر بعد یاسمین کے سر نے جنبش کی اور ہونٹ کپکپائے جیسے وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی ہو لیکن پھر فوراً ہی اس کا سر دوسری جانب ڈھلک گیا اور پورا جسم سرد پڑ گیا۔ لیکن خیام پھر بھی اس سے چمٹا رہا۔ آخر مجبور ہو کر ظفر نے باہر سے سپاہیوں کو بلا کر خیام کو یاسمین سے الگ کیا اور ایک سفید چادر یاسمین کے جسم پر ڈال دی۔ پھر لوبان اور اگر بتیاں جلا کر تمام لوگ قرآن خوانی کرنے لگے۔ سوائے خیام کے۔

یہ بات سب کو معلوم تھی کہ گھاٹ پر تعینات عملہ لاش کو کشتی پر نہیں لے جانے دے گا اس لیے قریب کی پہاڑی پر قبر کھودنے کی تیاری شروع کر دی گئی۔ لیکن خیام کو ان چیزوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ صبح سویرے جب لوگ جنازہ اٹھا کر لے جانے لگے تو بھی اس نے کسی کا ہاتھ نہیں بٹایا۔ صرف اشارے سے یاسمین کی تمام چیزیں اس کے ساتھ دفن کر دینے کو کہا اور پھر خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ بیچ بیچ میں وہ کبھی آسمان کو تکتا اور کبھی انگلیاں سیدھی کر کے اپنی ہتھیلیوں میں کچھ پڑھنے لگتا۔ کبھی بے خیالی میں کچھ الفاظ اس کی زبان سے نکل جاتے۔ خیام یوں ہی کب تک پھرتا رہا اور کیا کچھ کرتا رہا یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ صدیوں بعد دنیا اس سے اس وقت واقف ہوئی جب اس کی رباعیوں نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔

علی حیدر ملک کے افسانوں کا مجموعہ

بے زمیں بے آسماں

"نئی نسل کے لکھنے والوں میں سے تم مجھے اپنی شخصیت اور فن ہر دو اعتبار سے نہایت محبوب ہو۔ تمہارے یہاں خیال کی آباد کاری کا سماں کہانی میں جان سی پھونک دیتا ہے"۔

جوگندر پال

"میں نے پوری کتاب پڑھ ڈالی اور مجھے بہت خوشی ہوئی۔ بہت اچھی کہانیاں ہیں اور موضوعات میں تنوع ہے"۔

منشا یاد

علی حیدر ملک کے مضامین کا مجموعہ

افسانہ اور علامتی افسانہ

"Since he himself is an artist, his answers carry more weight than the answers of those who are merely professional critics."

Prof. Nazeer Siddiqi

"علی حیدر ملک بھی اُردو فکشن کی تنقید کے معماروں میں اہم اور جانا پہچانا نام ہے"۔

ڈاکٹر ارتضٰی کریم

شہزاد منظر اور منظر پبلی کیشنز کی مطبوعات

افسانے

ندیا کہاں ہے تیرا دیس	شہزاد منظر	60/=
بے زمیں بے آسماں	علی حیدر ملک	30/=
کپل وستو کا شہزادہ	اے خیام	100/=

ناول

اندھیری رات کا تنہا مسافر	شہزاد منظر	30/=

تنقید

افسانہ اور علامتی افسانہ	علی حیدر ملک	100/=
جدید اردو افسانہ	شہزاد منظر	25/=
ردِ عمل	،، ،،	30/=
علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ	،، ،،	100/=
پاکستان میں اُردو تنقید کے پچاس سال	،، ،،	120/=
پاکستان میں اُردو افسانے کے پچاس سال	،، ،،	250/=
مشرق و مغرب کے چند مشاہیر ادباء	،، ،،	120/=
غلام عباس۔ ایک مطالعہ	،، ،،	40/=
شہزاد منظر فن اور شخصیت	علی حیدر ملک / صبا اکرام	100/=

انتخابات

عصمت چغتائی کے دس بہترین افسانے	ترتیب و مقدمہ : شہزاد منظر	
بیدی کے دس بہترین افسانے	ترتیب و مقدمہ : شہزاد منظر	
کرشن چندر کے دس بہترین افسانے	ترتیب و مقدمہ : شہزاد منظر	150/=

سیاست

سندھ کے نسلی مسائل	شہزاد منظر	150/=

ترجمہ

عمر خیام اور دوسری غیر ملکی کہانیاں	علی حیدر ملک	150/=

زیرِ طبع تصانیف

محمد حسن عسکری ایک مطالعہ	تنقید	شہزاد منظر
جدید اردو ناول	" "	" "
راجندر سنگھ بیدی	" "	" "
ترقی پسند ادب کا مستقبل	" "	" "
فحش ادب کیا ہے؟	" "	" "
ہمارا تنقیدی ورثہ	" "	" "
اُردو کے بڑے افسانہ نگار	" "	" "
منٹو کے دس بہترین افسانے	انتخاب و مقدمہ	" "
غلام عباس کے دس بہترین افسانے	" "	" "
قرۃالعین حیدر کے دس بہترین افسانے	" "	" "



علی حیدر ملک